شریعت وطریقت کا حسین امتزاج

تصنیف

شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ

ترجمہ:

جناب ثناء الحق صدیقی (انڈیا)

طیب اکیڈمی بیرون بوہڑ گیٹ ملتان

شریعت وطریقت کا حسین امتزاج

تصنیف

شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ

ترجمہ:

جناب ثناء الحق صدیقی (انڈیا)

طیب اکیڈمی بیرون بوہڑ گیٹ ملتان

ضابطہ

نام کتاب .... مرج البحرین
باہتمام .... محمد اسحٰق عفی عنہ
سن اشاعت............... مئی 2001ء
طباعت............... سلامت اقبال پریس

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ بیرون بوہڑگیٹ ملتان
دارالاشاعت اردو بازار۔ کراچی نمبر 1
مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار۔ لاہور
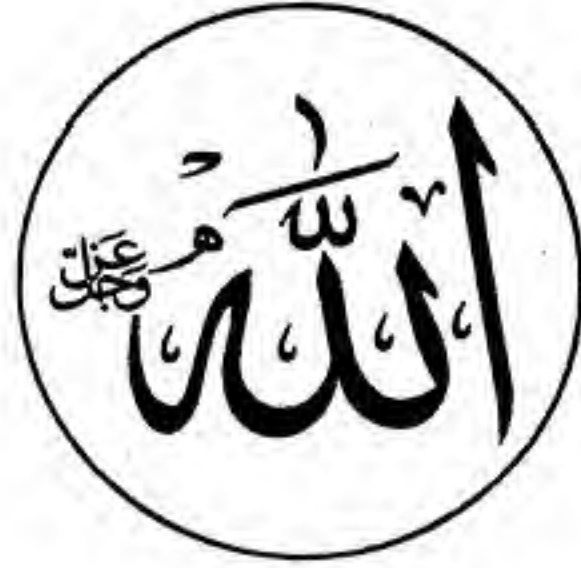
مکتبہ رشیدیہ۔ سرکی روڈ۔ کوئٹہ
یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار۔ پشاور
مکتبہ رشیدیہ۔ راجہ بازار۔ راولپنڈی۔
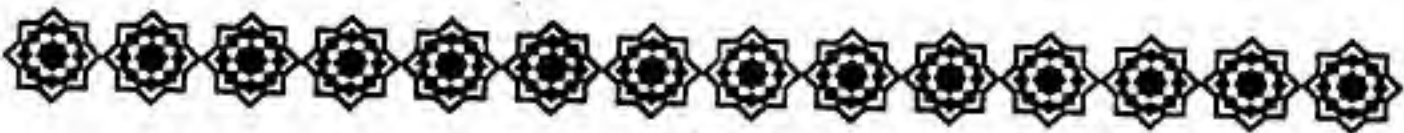
طیب اکیڈمی بیرون بوہڑگیٹ ملتان۔

فہرست مضامین رسالہ مرج البحرین

منظور ہے گزارش احوال واقعی...

اللہ تبارک و تعالیٰ کا بے پایاں شکر و احسان کہ اس نے مجھ سے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک نایاب کتاب "مرج البحرین" کو مع اردو ترجمہ شائع کرانے کا کام لیا۔ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے اور اس کے حسن و قبح پر میں آپ کی رائے جاننے کا متمنی بھی ہوں۔ ہماری حتی الوسع کوشش رہی ہے کہ اس کتاب کا گٹ اپ بھی حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ کے افکار عالیہ کی شایانِ شان ہے۔ ہمیں امید ہے کہ انشاءاللہ ہم اس پہلو سے آپ کی توقع پر پورے اتریں گے۔ لیکن یہاں پر میں اس دشوار گذار ماضی اور پر آشوب مستقبل کے بارے میں کچھ گوش گذار کرنا چاہتا ہوں، جن کا سامنا ہمیں ہے۔ واللہ المستعان۔

مجھے بچپن سے ہی حضرت شیخ قدس سرہٗ سے قلبی عقیدت و محبت رہی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہی نہیں تھی کہ آپ کی ذات بزرگوار سے نسبی تعلق کا شرف مجھ خاکسار کو حاصل رہا ہے بلکہ جب میں لوگوں سے حضرت شیخ المحدثین کے علمی تجر اور ان کے اجتہاد معرفت کے بارے میں سنتا تھا تو مجھے خواہش ہوتی تھی کہ کاش میں بھی ان نایاب جواہرات سے کماحقہٗ بہرہ ور ہو سکتا۔ شومئ نصیب سے تقسیم ہند کے بعد کے ایام کچھ ایسے دشوار گذار ثابت ہوئے کہ معاشی اور دیگر پریشانیوں کی وجہ سے ہم لوگوں کی خاطر خواہ تعلیم نہ ہو سکی اور اس محرومی نے اس احساس کی شکل اختیار کر لی کہ جس طرح بھی ممکن ہو حضرت شیخ المحدثین کی تعلیمات اور ان کی شخصیت سے عوام کو متعارف کرایا جائے۔ موجودہ کوشش بھی

اسی احساسِ ذمہ داری کا ایک حصّہ ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق ؒ کا زمانہ دسویں صدی ہجری کا زمانہ ہے۔ ان کی پیدائش محرم ۹۵۸ھ میں اور وفات ۲۱ اور ۲۲ ربیع الاوّل کی درمیانی شب میں ۱۰۵۲ھ میں ہوئی تھی۔ ہم لوگوں کے مورثِ اعلیٰ حضرت آقائے محمد ترک البخاری تھے جو کہ سلطان علاؤالدین خلجی کے دورِ حکومت میں ہندوستان تشریف لائے تھے۔ ان کی اولادوں میں حضرت شیخ محدث دہلوی ؒ نے چہار دانگ عالم نام کمایا۔ حضرت شیخ رحؒ کی تین نرینہ اولادیں تھیں۔ جن میں سے شیخ محمد ہاشم ہمارے جدّاعلیٰ تھے۔ میں اُن کی آٹھویں نسل کا نمائندہ ہوں۔ خاکسار کے گیارہ بھائی اور تین بہنیں ہیں۔ بیشتر کی شادیاں والدین نے اپنی زندگی میں ہی کردی تھیں۔ والد صاحب کا انتقال ۱۹۷۲ء ہوا اور ۱۹۸۰ء میں والدہ محترمہ بھی داغ مفارقت دے گئیں۔

والد صاحب بتایا کرتے تھے کہ تقسیم سے قبل حضرت شیخ محدث دہلوی کا عرس پاک بڑے اہتمام سے ہوا کرتا تھا۔ خاندان کے تمام لوگ اس کارِ خیر میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے تھے۔ پھر تقسیمِ وطن کی منحوس گھڑی آئی اور ہمارا بھرا پُرا خاندان تتر بتر ہوگیا۔ پاکستان جانے والوں میں ہمارے تین بھائی بھی تھے۔ والد صاحب چونکہ کٹّر قسم کے نیشنلسٹ تھے، لہٰذا انھوں نے پاکستان جانے سے سختی سے انکار کردیا۔ لیکن یہاں ہوا یہ کہ والد صاحب کی چاندی کی دوکان جو دریبہ میں واقع تھی، اس وقت کے فسادات کی نذر ہوگئی۔ تاہم والد صاحب نے ہمّت نہیں ہاری۔ ان کے جیسے متقی اور پرہیزگار شخص سے یہ کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا کہ وہ جھوٹے سچّے ہتھکنڈوں کے ذریعہ فسادات کا نقصان پورا کرنے کی بات سوچتے۔

۱۹۷۲ء میں جب والد صاحب کا انتقال ہوگیا تو خاکسار کو حضرت شیخ رحؒ کی درگاہ کی خدمت گذاری کے لیے خود کو وقف کرنا پڑا۔ چنانچہ گذشتہ ۲۴ برسوں سے خاکسار جدّی و مربّی حضرت شیخ المحدثین کے اعراس پابندی سے کراتا رہا ہے اور اُن کی درگاہ نیز ملحقہ مساجد و متعلقہ موقوفہ آراضی کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی ادا کرتا رہا ہے۔ یہ کام جو بظاہر آسان نظر آتا تھا، میرے لیے کئی موقعوں پر بڑے خطرات کا باعث ثابت ہوا

اور آج بھی اس کام میں ایسی مشکلات درپیش ہیں جن کی وجہ سے حضرت شیخؒ کے مشن کو کما حقہ آگے بڑھانے میں سخت دشواریوں کا سامنا ہے۔

تفصیل اس کی اس طرح ہے کہ فسادات کی افراتفری سے فائدہ اُٹھا کر بہت سے لوگوں نے درگاہ شیخ المحدثین سے ملحق آراضی پر ناجائز قبضہ کر لیا تھا۔ خاندان کی دوسری شاخ کے فرزند رشید محترم تسلیم الحق مرحوم اگرچہ تعلیم یافتہ تھے اور سرکاری عہدہ پر بھی تھے لیکن ذاتی مصروفیات کی بنا پر وہ اُن ناجائز قبضوں کے سلسلہ میں کچھ نہیں کر سکے۔ چنانچہ خاکسار نے ہی درگاہ اور اس سے ملحقہ آراضی کے تخلیہ کی ذمہ داری قبول کی۔ لیکن اس کام میں شورہ پشتوں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ بلکہ ۱۹۸۹ء میں ان لوگوں نے درگاہ کی مسجد کے امام کو قتل بھی کر ڈالا۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح ان تمام مشکلات کو جھیلا گیا اور ناجائز قبضوں کے خلاف مقدمات قائم کر دیئے گئے جو مختلف عدالتوں میں تاہنوز زیرِ سماعت ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ حیرت و افسوس کی بات یہ ہے کہ دہلی وقف بورڈ نے نہ تو خود کوئی اقدام کیا اور نہ ہی خاکسار کے ساتھ کوئی عملی تعاون کیا حتٰی کہ ہمیں یہ بھی اپنے طور پر معلوم کرنا پڑا کہ درگاہ کی موقوفہ آراضی کتنی اور کہاں کہاں ہے؟ چونکہ وقف بورڈ نے ہمیں کوئی بھی رکارڈ بہم نہیں پہنچایا لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تمام موقوفہ آراضی ہمارے علم میں آ چکی ہے یا ابھی کچھ اور آراضی کسی ناجائز قبضہ میں باقی ہے۔

ہمارا پلان یہ ہے کہ ناجائز قبضوں کے تخلیہ کے بعد ہم اس آراضی پر ایک جدید طرز کی اسلامی لائبریری اور ایک دینی مدرسہ قائم کریں گے۔ قبرستان کی خبر گیری بھی فوری توجہ کی طالب ہے کیونکہ مناسب حد بندی نہ ہو سکنے کی وجہ سے بہت سی قبروں کی نگہداشت مناسب ڈھنگ سے نہیں ہو پا رہی ہے۔ قبرستان سے ہی ملحق بڑی آراضی غیر آباد پڑی ہے۔ اسی جگہ پر ان شاء اللہ حضرت شیخ المحدثین کی یادگار کے بطور مذکورۂ بالا مدرسہ نیز دار المطالعہ قائم کیا جائے گا جو ان شاء اللہ حضرت شیخ المحدثینؒ کے شایانِ شان ہوگا۔

حضرت شیخ کے علمی مرتبہ کے بارے میں خاکسار کا کچھ عرض کرنا چھوٹا منہ بڑی بات کے مصداق ہوگا۔ ع۔ چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک؟ تاہم یہ بات تو معروف ہے کہ

ہندوستان میں علم حدیث کا احیاء حضرت والا تبار کی ذات گرامی سے ہی ہوا۔ چنانچہ ہندوستان کے محدثین میں شاید ہی کوئی ایسا سلسلہ ہو جو روایت حدیث میں حضرت شیخ کے توسل سے مستغنی ہو۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ حضرت شیخؒ کی ذات و تعلیمات پر ہندوستان میں تقریباً کچھ بھی کام نہیں ہوا ہے اور حضرت شیخؒ کی متعدد تصنیفات نایاب ہوتی جا رہی ہیں۔ انہی دونوں مقاصد کی تکمیل کی خاطر ہم نے اکتوبر ۱۹۹۱ء میں شیخ عبدالحق محدثؒ اکیڈمی قائم کی۔

اکیڈمی کی جانب سے پہلے تو ہم نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ حضرت شیخؒ کی نایاب کتابوں کے نسخے کہاں کہاں دستیاب ہیں اور یہ کہ حضرت شیخؒ کی ذات و تعلیمات پر تحقیقی کام دنیا میں کہاں کہاں ہو رہا ہے۔ الحمد للہ مجھے یہ بتاتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ دنیا کی متعدد یونیورسٹیوں میں حضرت شیخؒ کی ذات و تعلیمات پر تحقیقی کام ہو رہا ہے اور اُن کی متعدد کتابوں کا عالمی زبانوں میں ترجمہ کیا جا چکا ہے۔ امریکہ کی سٹی یونیورسٹی، مصر کی جامعہ ازہر، جرمنی کی بون یونیورسٹی اور ہندوستان کی جامعہ عثمانیہ سے اسکالرز نے حضرت شیخ کی ذات و تعلیمات پر تحقیقی کام کر کے پی ایچ ڈی / ڈی لٹ / اس کے مساوی سند نامے حاصل کیے ہیں۔ پاکستان اور مغربی جرمنی میں حضرت شیخ کی متعدد نایاب کتابوں کی مائکرو فلمیں تیار کی گئی ہیں یا انھیں فوٹو آفسیٹ پر شائع کیا گیا ہے۔ ہمارا پلان ہے کہ انشاء اللہ ہم اِن تمام نایاب کتابوں نیز تحقیقی کارناموں کو اکیڈمی کی جانب سے شائع کرانے کا اہتمام کریں گے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

آخر میں خاکسار اس کتاب کے قارئین، ناشرین اور معاونین کا صدق دل کے ساتھ شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ میں خاص طور پر پروفیسر خلیق احمد نظامی علیگ، مفتی محمد مکرم احمد صاحب (امام و خطیب شاہی مسجد فتحپوری) خواجہ حسن ثانی نظامی (درگاہ خواجہ نظام الدینؒ)، جناب محمد اقبال صابری صاحب، جناب شوکت علی ہاشمی صاحب اور جناب چاند میاں کے تئیں اپنی ممنونیت کا

اظہار کرتا ہوں جنھوں نے اپنے قیمتی مشوروں اور اپنے قیمتی وقت سے ہمیں اپنا گراں قدر تعاون دیا اور آئندہ بھی اُن سے اسی کی توقع ہے انشاء اللہ۔
وللّٰہ الامر من قبل و من بعد۔

والسلام
ضیاء الحق سوزؔ حقّی دہلوی
نبیرۂ شیخ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سخن ہائے گفتنی

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے سوانح سیرت پر اہل بصیرت نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن افسوس ہے کہ ان کے علمی اور تجدیدی کارناموں پر کام کم ہوا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی سیرت کا یہ گوشہ غیر مکمل ہے۔ ان کے علمی اور تجدیدی کارناموں میں تصوف کا علمی و عملی پہلو بھی ہے۔

حضرت شیخؒ طبعاً صوفی تھے۔ تصوف ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ آپ کی زندگی کا بڑا حصہ اس کی تحصیل میں گزرا۔ اور اسی لگن، محنت اور محبت کا نتیجہ ہے جو آپ کی تصانیف میں ہر پہلو سے عیاں ہے۔ پوری زندگی سرتاپا تصوف میں ڈھلی نظر آتی ہے۔ اور علمی اعتبار سے معلوم کرنا چاہیں تو "مرج البحرین فی الجمع بین الطریقین" اور "تحصیل التعرف فی الفقہ والتصوف" کا مطالعہ حقیقت کو واضح کرتا ہے۔

مرج البحرین فی الجمع بین الطریقین، قواعد الطریقہ فی الجمع بین الشریعۃ والحقیقۃ مصنفہ شیخ شہاب الدینؒ ابو العباس احمد برنسی مالکی، معروف بشیخ زروق المتوفی ۸۹۹ھ کی نہایت مفید و مختصر تلخیص ہی نہیں بلکہ اس میں فنِ تصوف کے اہم نکات و اسرار ہیں۔ شیخ محدث نے "المکاتیب والرسائل الی ارباب الکمال والفضائل" میں اپنے شیخ طریقت کے حوالے سے جابجا ایک خاص ترتیب سے واضح کئے ہیں۔ اس نسخہ میں حضرت شیخ کا تصوف سے لگاؤ ہی نہیں بلکہ شیخ وہابؒ متقی (شیخ طریقت) و شیخ علی متقیؒ برہانپوری ثم مکی کے نظریہ تصوف کا بھی سراغ ملتا ہے۔ چونکہ شیخؒ ان حضرات کے علمی عملی تصوف کے داعی و ترجمان اور ان کی ہی تعلیمات کے پیرو

اور پابند تھے۔

مرج البحرین کے مطالعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شیخ علی متقیؒ و شیخ وہاب متقیؒ کی تعلیمات نے ان کی سیرت پر کیا اثرات مرتب کیے۔ اور پوری زندگی تصوف و تقویٰ کے زیر اثر رہی اس کتاب سے وہ فقیہ استفادہ کر سکتا ہے جو تصوف کا دلدادہ اور احوال کا نگراں ہو۔ اور وہ صوفی بھی جو محقق ہو اور اعمال کا پابند ہو۔ سرکش اور بے راہ رو فقیہ، کج رو اور غلو کرنے والا اور حق سے دور رہنے والا صوفی اس کتاب سے اپنی اصلاح کر سکتا ہے۔ یہ دونوں جہت (فقہ و تصوف) کی محافظ اور دونوں طریقوں کی جامع ہے۔ تصوف کا مرکزی نقطہ کیا ہے، زندگی کے کن کن شعبوں کی اصلاح کی طرف توجہ زیادہ مرکوز ہونی چاہیے شیخ کی نظر خاص رہی ہے۔

شیخ کی کئی شہرۂ آفاق تصانیف کا مطالعہ کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے مگر شیخ نے جس طرح شریعت و طریقت میں توازن، اعتدال اور محتاط طریقہ اپنایا ہے اس کی مثال کم نظر آتی ہے۔ مرج البحرین میں شریعت و طریقت کے درمیان مطابقت و توازن کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ اس میں شیخ نے شریعت و طریقت کے انتہا پسندانہ نظریات کے درمیان معتدل راہ دکھائی ہے۔ اور نہایت موثر انداز سے دلائل و شواہد کے ساتھ یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ یہ دونوں ایک شے ہیں۔ البتہ شریعت کو طریقت پر برتری حاصل ہے۔ شریعت پر عمل ضروری ہے۔ اس میں تبدیلی ممکن نہیں۔ طریقت کے احکام سب کے لیے نہیں ہیں۔ ذوق و حال و وجدان کے اختلاف کی بنا پر اس میں تبدیلی ممکن ہے۔ یہ فرق بتا کر کہا ہے کہ کمال کے درجہ تک پہنچنے کے لیے دونوں کا حاصل کرنا ضروری ہے۔ البتہ راہ حق کے متلاشی کو "فقیہ صوفی بننا چاہیے"، "صوفی فقیہ" نہیں، یعنی پہلے شریعت کا علم حاصل کر کے اس پر عمل پیرا ہو۔ بعدہٗ راہ طریقت میں قدم رکھے۔

محبی جناب ضیاء الحق سوز حقی دہلوی جو نبیرہ شیخ محدثؒ ہیں۔ کتاب مذکور کو پاکستان سے لائے جو نہایت خستہ حالت میں تھی۔ سوز صاحب درگاہ شیخ

محدث کے متولی وگدی نشین ہیں اور تن من دھن سے اپنے جدِ امجد حضرت شیخ کی درگاہ و اعراس وغیرہ میں مشغول ومصروف رہتے ہیں۔ موصوف ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ درگاہ دوبارہ حاصل کی تقسیم وطن کے بعد تمام قبرستان بشمول درگاہ پر ناجائز قبضے ہوگئے تھے۔ عرصہ ۱۴ سال سے باقاعدہ ۲۲ ربیع الاول جو تاریخ وفات ہے۔ آپ کا عرس منایا جارہا ہے۔ علماء مشائخ و عقیدت مندان حضرت کے قل شریف میں شرکت کرتے ہیں۔ تقاریر، نعت خوانی ولنگر کا معقول انتظام ہوتا ہے۔ تمام اخراجات سوز صاحب جیب خاص سے کرتے ہیں۔ سوز صاحب کی عرصہ سے دیرینہ خواہش تھی کہ حضرت شیخ کے علمی و دینی کام کو عوامی سطح پر عام کیا جائے۔ چنانچہ فدوی کو اس مشورہ میں شرکت کی دعوت دی اور کئی معزز حضرات اس نیک مقصد کے معاون و مددگار ہوئے چنانچہ حضرت شیخ عبدالحق محدث اکاڈمی کا قیام عمل میں آیا۔ اکاڈمی کے اغراض ومقاصد میں اولیت حضرت شیخ کی تصنیفات کا دوبارہ اور جدید طریقے سے طباعت واجراء دوئم آپ کی علمی وروحانی خدمات کو عالمی سطح پر مذاکرات کے ذریعہ عام کرنا۔ سالانہ یوم ولادت پر سمینار کا انعقاد کرنا۔ چنانچہ ایک عالمی سمینار کے منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور کتاب مذکور کا اجراء۔

فدوی کے کاندھوں پر محترم سوز صاحب نے جو جو ذمہ داریاں ڈالی ہیں بطفیل سرورِ کائنات ﷺ خداوند قدوس تکمیل تک پہنچائے۔

قارئین سے دعا کی درخواست ہے۔ کتاب مذکور مع ترجمہ اور حواشی کے حاضر ہے۔ اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو تو معاف فرمائیں۔ جس عظیم مصلح پر یہ کام ہو رہا ہے دراصل وہ احیاء شریعتِ دین محمدیؐ اور قیام امر بالمعروف میں صرف کی گئی محنت ہے۔ پروردگار اس خدمت کو قبول فرمائے۔ اور جس طرح اور جس وقت حضرت شیخ نے اسلامی شعار کی تضحیک وتوہین کی تاریکیوں

کا ازالہ کیا تھا آج بھی ان کی تعلیمات سے موجودہ حالات میں جو اسلام دشمن طاقتیں اسلامی اقدار و روایات کو مٹانے کی مذموم کوششوں میں مصروف ہیں۔ان کی تعلیمات کو مشعلِ راہ بنا کر مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

طالب دعا
فقیر
محمد اقبال صابری ردولوی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ٭

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مُحَمَّدٍ سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَ اِمَامِ الْمُتَّقِیْنَ وَخَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ وَاَحْزَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ٭ (یعنی تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جو تمام عالموں کا پروردگار ہے۔ اور رحمت کاملہ وسلام نازل ہو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، پیغمبروں کے سردار اور پرہیزگاروں کے پیشوا اور جملہ انبیا کے خاتم پر اور آپ کے آل و اصحاب پر اور آپؐ کے تمام متبعین اور آپؐ کی جماعتوں پر) امّا بعد

رسالہ کا موضوع فقیر عبدالحق بن سیف الدین قادری دہلویؒ کی جانب سے عرض ہے کہ یہ ایک رسالہ ہے جس کا نام "مرج البحرین" ہے اور جو دو طریقوں کا جامع ہے جن میں ایک فقہ ہے اور دوسرا تصوف ـــــ ایک شریعت ہے اور دوسرا طریقت، ایک ظاہر ہے دوسرا باطن، ایک صورت ہے اور دوسرا معنی، ایک چھلکا ہے دوسرا مغز، ایک علم ہے اور دوسرا حال، ایک ہوشیاری ہے دوسرا مستی، ایک مذہب ہے دوسرا مشرب (طریقہ)۔ ایک عقل ہے دوسرا عشق۔ اور اگر اس کو سیدھا راستہ اور راہِ استوار کا نام دیا جائے تو جائز ہوگا۔ نیز اگر دین خالص اور سلامتی کے راستہ کے لقب سے یاد کیا جائے تو روا ہوگا۔ اور اگر دعوتِ حق اور راہِ نجات (سبیلِ رشاد) کہیں تو درست، اور میزانِ عدل اور دستور العمل گردانیں تو صحیح ہے۔ یہ طریقہ فقہ کے ماننے والوں کو طریقِ تصوف کے انکار سے روکتا اور اہلِ تصوف کو مذہب فقہ کے دائرہ کے اندر رکھتا ہے۔ مگر ہر فقیہ سرکش متکشف خیال کیا جائے گا اور ہر متصوف حقیقت سے دور، اپنے مسلک میں غالی سمجھا جائے گا۔ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیَانِ

بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ (الآیۃ) (یعنی دو دریا جو ایک دوسرے سے ملنے کو ہوں ان کے درمیان پردہ کر دیا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے پر غالب نہ آجائیں) ؎

بر کفے جامِ شریعت بر کفے سندانِ عشق　　　ہر ہوسناکے نہ داند جام وسنداں باختن

(یعنی ایک ہاتھ میں جامِ شریعت ہو اور ایک ہاتھ میں سندانِ (اہرن) عشق۔ لیکن ہر ہوسناک کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ جام (پیالے) اور سندان (اہرن) دونوں کے ساتھ شغل کر سکے)۔

ہمارا پروردگار تعالیٰ شانہ ہمیں اور تمام مسلمانوں کو اور ہمارے دوستوں کو امن کی جگہ اور سلامتی کے ٹھکانے سے نہ ہٹائے اور حق کے مرکز اور صدق کی جگہ پر ثابت قدم رکھے۔ اور راہِ راست، دین درست اور اعتقادِ صحیح کی توفیق دے (آمین) قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (الآیۃ) (یعنی کہہ دیجئے کہ یہ میرا راستہ ہے، میں خدا کی راہ کی طرف بلاتا ہوں اور میرے متبعین بھی اسی جانب بلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ پاک ہے اور میں شرک میں مبتلا نہیں ہوں)۔ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت اور سلامتی ہو، رسولوں کے سردار، اور کل جہان کے امام اور مخلوقات کے رہنما اور خلقت کے ہادی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر، ان کی آل اور جملہ اصحاب پر۔

فرقہ بندی کی پیشین گوئی

حضرت ابوہریرہ[1] رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی ان میں سے ایک کے سوا سب دوزخی ہوں گے۔" صحابہؓ نے دریافت کیا "یا رسول اللہ وہ نجات پانے والا فرقہ کونسا ہوگا؟"

---

[1] حضرت ابوہریرہؓ مشہور صحابی ہیں۔ اصحابِ صفہ میں آپ کا شمار ہے۔ غزوۂ خیبر والے سال میں آپ اسلام لائے لیکن صحبتِ نبویؐ سے بے انتہا فیض یاب ہوئے۔ چنانچہ سب سے زیادہ احادیث آپ ہی سے مروی ہیں۔ آپ نے تقریباً آٹھ سو صحابہؓ سے روایت کی ہے ۔۔۔ ۵۷ھ/۶۷۷ء میں پچھتر سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔

آپؐ نے ارشاد فرمایا: "یہ وہ لوگ ہوں گے جو اس راستہ کو اختیار کریں گے جس پر میں ہوں اور میرے اصحاب گامزن ہیں۔" اس حدیث کو ترمذی اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اس کو حدیث حسن صحیح بتایا ہے۔ (الحدیث)

یعنی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سید الانبیا وسند الاصفیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری امت میں اس اعتبار سے کہ مجھ پر وہ لوگ ایمان لائے ہیں اور دینِ اسلام میں داخل ہوئے ہیں اور منہ قبلہ کی طرف کرتے ہیں تہتر۷۳ فرقے ہو جائیں گے۔ ہر فرقہ کا عقیدہ الگ اور راستہ جداگانہ ہوگا۔ ان میں سے بہتر۷۲ فرقے دوزخ میں جائیں گے اور گمراہی کے سبب اور عقیدہ کی خرابی کی وجہ سے اور بدعت کی نحوست کے باعث عذابِ نار میں گرفتار ہوں گے۔ جب تک کہ قادرِ مطلق چاہے کہ ان کو اس آلائش اور کثافت سے پاک کر کے جنت میں داخل کرے اور ان تہتر۷۳ فرقوں میں سے ایک فرقہ ایسا ہوگا جو دوزخ میں نہیں جائے گا اور اپنی عقیدت کے سبب عذاب کا مستحق نہیں ہوگا۔" صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا۔۔۔ "یارسول اللہؐ اس فرقہ میں جو ہدایت پر قائم رہے گا اور دوزخ میں نہیں جائے گا کون لوگ ہوں گے؟" آپؐ نے فرمایا کہ "وہ لوگ ہوں گے جو میرے اور میرے اصحابؓ کے مذہب و اعتقاد پر رہیں گے۔"

اہلِ قبلہ کو کافر نہیں کہنا چاہیئے

وہ بہتر۷۲ فرقے اہلِ بدعت و ضلالت اور نفس کے بندے کہلاتے ہیں، اور ان کو اہلِ قبلہ بھی کہا جاتا ہے۔ اہلِ قبلہ کو کافر نہیں کہنا چاہیئے اور نہ ان کو دائرۂ اسلام سے خارج سمجھنا چاہیئے کیونکہ فرقۂ ناجیہ سے ان کا اختلاف ہر کہیں اور ہر بات میں نہیں ہے بلکہ محض بعض مسائل و عقائد ایسے ہیں جن میں وہ خطا پر ہیں اور نصوص کے ظاہر کی بنا پر تاویل اور اس میں تبدیلی کر کے جادۂ مستقیم سے منحرف ہو گئے ہیں۔

کفر و ضلالت کی وضاحت

کفر و ضلالت کے درمیان فرق، بہت سی باتوں میں سے صرف اس بات پر قیاس کر کے سمجھا جا سکتا ہے کہ مثلاً ایک جماعت ایسی ہے جو مشرق کی جانب منہ کئے ہوئے ہے۔ ان میں سے ایک حصّہ ایسا ہے جو بیچوں بیچ سے ہو کر بخطِ مستقیم جو قریب ترین راستہ ہے اس کو اختیار کرتا اور اس پر چلتا ہے اور دوسرے فرقے ایسے ہیں کہ ان کا بھی مقصد تو وہی ہے، لیکن وہ کسی قدر دائیں بائیں ہو کر چلتے ہیں اور اس طرح کسی حد تک جنوب یا شمال کی طرف جا پڑتے ہیں۔ چند قدم نہیں چلتے کہ پھر مشرق کی طرف رجوع ہو جاتے ہیں اور پھر اپنی مجوزہ راہ پر آجاتے ہیں۔ بعض اس راہ سے قریب اور بعض کسی قدر دُور رہتے ہیں لیکن اس فرق کے باوجود مقصد سے کچھ دُور یا نزدیک ہوتے ہیں۔ اسی میں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کسی ایک پر کوئی آفت نازل ہو جائے کہ اس سے وہ فرقہ ہلاک ہو جائے۔ درحقیقت غلط راہ چلنے کی آفتیں بہت ہیں۔ دوسرے فرقے بھی اس قدر دُور ہو جاتے ہیں کہ ان کا بھی راہِ راست کی طرف رجوع کرنا مشکل ہو جاتا ہے مگر اتنا ضرور ہے کہ وہ حصولِ مقصد کی نیت اور مقصود کی طلب اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ یہ سب اہلِ ضلالت ہیں کہ اگرچہ وہ چلنے والے ہیں لیکن ساتھ ہلاک ہونے والے بھی ہیں اور اگرچہ وہ راہرو کہے جائیں گے مگر اصل میں راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں۔

ایک جماعت ان لوگوں کی ہے جو مشرق کی طرف سے مطلق پشت کئے ہوئے ہیں اور اپنا منہ مغرب کی طرف رکھتے ہیں اور کسی طرح اور کسی وجہ سے بھی اپنا رُخ مشرق کی جانب نہیں کرتے، نہ وہ مشرق کی راہ کا قصد رکھنے والوں کے ساتھ موافقت برتتے ہیں۔ یہ مثال اہلِ کفر کی ہے کہ وہ اپنے قصد میں، مقصد میں دینِ اسلام کے مخالف اور اس سے جُدا ہیں۔

اہلِ ضلالت کی بھی پشت اگرچہ کبھی کبھی منزلِ مقصود کی طرف ہو جاتی ہے لیکن چند قدم یا چند میل یا چند فرسخ یا چند منزلوں کے بعد بَالِغًا مَّا بَلَغَ اِلٰی مَاشَاءَ اللّٰہُ تَعَالٰی (یعنی جہاں تک اللہ تعالیٰ پہنچانا چاہے وہاں تک پہنچ جائیں) ان کا رخ حقیقت کے

قبلہ کی طرف ہوجاتا ہے اور ان کا قدم سیدھے راستے پر جا پڑتا ہے ؎

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ | چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

(یعنی بہتر۷۲ فرقوں کے درمیان جو نزاع جاری ہے اس میں ان سب کو معذور سمجھو کیونکہ جب انھیں حقیقت نظر نہیں آتی تو وہ سند کے طور پر اپنے اسلاف کے طرزِ عمل کو پیش کر دیتے ہیں)۔

وصل ۲

دنیا کی محبت خطاؤں کا اصلی سبب ہے

جو چیز موجب کفر و ضلالت ہے وہ دنیا کی محبت، خواہشات نفسانیہ کے اتباع اور عقل پر بھروسہ کے علاوہ نہیں ہے: حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ (یعنی دنیا کی محبت تمام خطاؤں کی جڑ ہے) جیسا کہ کہا گیا ہے کہ کسی آدمی پر دنیا کی محبت اس درجہ غالب آجاتی ہے کہ وہ اس کی وجہ سے دائرۂ ایمان سے خارج ہوجاتا ہے۔ اور کسی کو یہ محبت فرائض کی ادائیگی، سنت کے اتباع اور نفلوں پر استواری اور استقامت کے التزام سے باز رکھتی ہے اور جس طریقے سے بھی اس کو دنیا، مال و متاع اور عزت و جاہ حاصل ہو سکتے ہیں وہ اسی طریقے کو اختیار کرتا ہے اور جس راستے پر چل کر اس کو ان چیزوں کا حصول ممکن نظر آتا ہے اسی راہ پر چلتا ہے اور نفس اور شیطان کی متابعت کرتا ہے یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اپنی سمجھ بوجھ پر اترانے لگتا ہے اور اپنی عقل پر پورا اعتماد کر لیتا ہے۔ وہ اپنے طرزِ عمل کو صحیح سمجھتا ہے خواہ وہ کفر و معصیت ہی ہو۔ اور نفس کی یہ خاصیت ہے کہ وہ اپنے کسی عیب یا کسی برائی کو قبول نہیں کرتا اور خود کو ملزم اور مغلوب ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا بلکہ لوگوں سے کٹھ حجتی سے پیش آتا ہے اور اپنے اوپر سے بُرائی کو ہٹانے کے لئے معاصی کو حلال اور برائیوں کو مستحسن قرار دیدیتا ہے اور اپنے مذہب کو تقویت پہنچانے اور اس کو رواج دینے کی غرض سے نیز اپنے کردار کی تحسین و تعریف حاصل کرنے کی غرض سے دلیلیں گھڑ لیتا ہے اور جس چیز کو اپنے نفس کے خلاف اور اپنی رائے کے برعکس پاتا

ہے خواہ وہ آیاتِ قرآنی ہوں یا احادیثِ نبویؐ، ان کی تاویل کر لیتا یا ان کو توڑ مروڑ کر پیش کر دیتا ہے یہاں تک کہ آخر کار وہ بے دین اور ملحد ہو جاتا ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم اور دوزخ ہو جاتا ہے: نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذَالِكَ (یعنی ہم زندقہ اور الحاد سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں)۔

دُورِ رسالت سے بُعد کا نتیجہ

نورِ ایمان ویقین کے سمجھنے اور تردد اور طعن و قیاس کی تاریکی میں جا پڑنے کا حقیقی سبب زمانۂ نبوت سے دُوری، مرکزِ حقیقت سے بُعد اور نزولِ قرآن اور انوارِ وحی کے ورود کے وقت حاضری سے محجوب ہو جانا ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں فراستِ دینی کا پیدا ہونا، صرف اس لئے تھا کہ جمالِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشاہدہ سے وہ کشف ویقین کے اس درجہ پر فائز ہو چکے تھے کہ تردد و تذبذب کے لئے ان کے دل میں جگہ پانے کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا تھا۔ چنانچہ اس وقت کے مومنوں کے کلمۂ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پر ایمان کا تو ذکر ہی کیا ہے کافروں کو بھی اس میں شک اور تردد نہیں تھا بلکہ اس وقت کافروں کو شک و تردّد سابقہ حسد اور دشمنی اور شقاوتِ ازلی اور خدائے تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی تقدیر کے سبب سے تھا۔

قرآنِ کریم کی لذت وحلاوت

ابوجہل[1] لعنت اللہ علیہ نے جو ظالموں اور گمراہ لوگوں کا سردار اور راندۂ درگاہِ خداوندی تھا بارہا قرآن شریف سُنا۔ وہ رونا تھا اور کہتا تھا کہ مجھے یقین ہے کہ یہ کلام کسی بشر یا انسان کا گھڑا ہوا نہیں ہے۔ اس کلام کا طرز اور انداز کسی دوسرے

---

[1] ابوجہل کا اصلی نام عمر بن ہشام تھا۔ انکارِ حق کی وجہ سے وہ اس لقب کا مستحق سمجھا گیا اور اسی لقب سے اسے دائمی شہرت بلکہ بدنامی نصیب ہوئی۔ وہ قریشِ مکہ کے سربرآوردہ لوگوں میں سے تھا۔ دارالندوہ میں اسی نے مشورہ دیا تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دیا جائے۔ بدر کی لڑائی میں بھی پیش پیش تھا اسی معرکہ میں دو نوعمر بھائیوں معاذؓ اور معوذؓ کے ہاتھوں قتل ہوا۔

ہی عالم کا ہے: اِنَّ لَہٗ لَحَلَاوَۃً وَاِنَّ لَہٗ لَطَلَاوَۃً (یعنی حقیقت یہ ہے کہ اس میں جو مٹھاس اور تازگی ہے وہ کسی دوسرے کلام میں نہیں ہے)۔ لیکن کیا کروں کہ شیطان جو نفس کی صورت میں میرے پیچھے لگا ہوا ہے اس نے ایسا وسوسے میں ڈالا ہے کہ کسی طرح قابو میں نہیں آتا۔

غیبت و حضور کے حال کا فرق آنحضرت

آنحضرتؐ کے وصال پر صحابہؓ کی کیفیتِ قلب

صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے دن ہی ظہور میں آگیا۔ چنانچہ حضرت انس[1] رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے اور آپؐ کے آفتابِ جمال نے پردہ فرمایا تو ہمارے حال میں تبدیلی رونما ہوگئی اور ہمارے دلوں کے سامنے ایک ایسا حجاب پیدا ہوگیا کہ اس کی وجہ سے معرفت کا سررشتہ ہاتھ سے چھوٹ گیا اور نورِ یقین میں کمی محسوس ہونے لگی ؎

رہ ندیدم چو برفت از نظرم صورتِ دوست ہمچو چشمے کہ چراغش زمقابل برود

(یعنی جب محبوب کی صورت میری نظر سے اوجھل ہوگئی تو مجھے راستہ تک نظر نہیں آتا تھا یہ بالکل ایسا ہی ہوا جیسا اس وقت ہوتا ہے جب سامنے سے چراغ چلا جائے تو آنکھ کچھ بھی نہیں دیکھ سکتی)۔

اس سے بھی زیادہ بلند تر اور لطیف تر بات ایک اور ہے

عہدِ رسالت میں غیبت و حضور کا فرق

---

[1] انسؓ بن مالک بن النضر صحابہ انصار میں شامل ہیں، کنیت ابوحمزہ ہے۔ ہجرت کے وقت آپ کی عمر صرف دس سال تھی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو حضرت انسؓ کی والدہ اُمِ سلیمؓ نے آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا چنانچہ آخر وقت تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خادمِ خاص رہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت انسؓ کو زیادتی عمر، دولت اور اولاد کی دعا دی چنانچہ آپ کا تقریباً ایک سو چار سال کی عمر میں (۹۳ھ / ۷۱۲ء) بمقام بصرہ انتقال ہوا۔ آپ کا شمار متمول صحابہؓ میں تھا۔ نہایت کثیر العیال تھے، بہت سی احادیث کے راوی ہیں۔

وہ یہ کہ حضرت حنظلہ[۱] رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جن کو حنظلہ "الغسیل الملائکہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جو کاتب وحی تھے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے آکر یہ شکایت کی کہ نَافَقَ حَنْظَلَۃُ (یعنی حنظلہ منافق ہو گیا)۔ (اور اپنے متعلق یہ بھی کہا کہ) "میں حنظلہ کو بہت مخلصین میں سمجھتا تھا لیکن آخر میں معلوم ہوا کہ وہ تو منافق صفت نکلا۔ اس کا دل زبان کے ساتھ اور ظاہر باطن کے ساتھ یکساں نہیں ہے۔ اور اس کے حال میں استقامت اور پائیداری نہیں۔" حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: "حاش للہ" (پاکی ہے خدا کو) آخر یہ کیا گفتگو ہے جو تم کر رہے ہو۔ اور تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ تمھاری حالت کیسی ہے اور تمھارا مقصود کیا ہے۔" انھوں نے کہا "جس وقت کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سامنے ہوتے ہیں اور آپؐ کے جمالِ پُر نور کا نظارہ کرتے ہیں اور آپؐ کی گفتگو سنتے ہیں تو نورِ یقین ایسا جلوہ گر ہوتا ہے گویا ہم حقیقت کو اپنی ظاہری آنکھ سے دیکھ رہے ہیں اور جنت اور دوزخ کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ لیکن اس کے بعد جب آپؐ کی خدمت سے واپس آتے ہیں اور اپنے بیوی بچوں سے ملتے ہیں اور گھر کے سازوسامان پر نظر ڈالتے ہیں تو ہماری حالت بدل جاتی ہے سر رشتہ گم ہو جاتا ہے اور جو کچھ یاد تھا اس میں بہت سا حصہ ذہن سے قطعاً محو ہو جاتا ہے۔"

اب دیکھیے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہ سب سے پہلے ایمان لانے والوں

---

[۱] حضرت حنظلہؓ بن ابی عامر غزوۂ احد میں کسی وجہ سے اول سے شریک نہ ہو سکے تھے۔ شب کو بیوی سے ہمبستر ہونے کے بعد غسل کی تیاری کر رہے تھے کہ مسلمانوں کی شکست کی آواز کان میں پڑی جس کی تاب نہ لا کر اسی حالت میں بغیر غسل کئے تلوار ہاتھ میں لئے میدانِ جنگ میں پہنچ گئے اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ملائکہ ان کو غسل دے رہے ہیں۔ اس لئے ان کو غسیل الملائکہ کہا جاتا ہے۔

حضرت حنظلہ رضؓ بن الربیع دوسرے صحابی ہیں جو کاتبانِ وحی میں نہایت بلند مقام رکھتے ہیں۔

میں سے تے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے تصدیق کرنے والوں کے سردار تھے، اس کے جواب میں کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے :

"ارے بھائی! تم یہ کیا کہتے ہو۔ خود ہمارا حال بھی اسی طرح پر ہے۔"

پس حضرت حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہمراہ مشہدِ حضورؐ میں جس سے مراد سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسِ پُر نور ہے حاضر ہوئے اور اپنا حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو عرض کیا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: "غم مت کرو اور کسی اندیشے کو دل میں جگہ دو کہ حضور و غیبت کی کیفیت اور خاصیت یہی ہے۔ اگر ہمیشہ اسی حال میں رہو کہ جو بوقتِ حضور تمہیں محسوس ہوتی ہے تو تم حقیقت کو علانیہ پا جاؤ اور فرشتوں سے مصافحہ کرنے لگو۔ وہ کبھی جلوہ دکھا دیتے ہیں اور کبھی اوجھل ہو جاتے ہیں۔"

اگر درویش بر یک حال ماندے | سر دست از دو عالم برفشاندے
گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم | گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

(یعنی اگر کوئی درویش ایک ہی حالت میں رہے تو وہ دونوں عالم کو حقیر سمجھنے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ میں کبھی پُر رفعت عمارتوں پر جا بیٹھتا ہوں لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنے پاؤں کے اوپر کے حصہ کو بھی نہیں دیکھ سکتا۔)

صحابہؓ کے یقین کی کیفیت

اب یہ بات معلوم ہو گئی کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی حالت (جو مقربانِ درگاہ اور آگاہی و معرفت رکھنے والوں کے سردار ہیں) نورِ نبوت کے غیبت اور حضور کے مطابق بدلتی اور مختلف ہو جاتی تھی۔ ایسی صورت میں دوسروں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ لیکن یہاں ایک نازک بات اور دوسرا نکتہ جس کی طرف لوگ دھیان نہیں دیتے یہ ہے کہ ان کے یقین و اعتقاد کی اصل قصور پر تھی یا فتور پر۔ درحقیقت فرق مشاہدہ کی کیفیت اور حجاب کی کثافت اور لطافت کے درمیان ہے۔ چنانچہ دیوار بھی ایک حجاب ہے اور شیشہ بھی حجاب ہے لیکن اِس سے اُس کو کیا نسبت۔ جو شخص اپنے محبوب کے ساتھ ایک ہی جگہ پر ہے، تاریک رات اور روزِ روشن اس کے یقینِ قلب کے معاملہ میں ایک ہی حکم رکھتے ہیں۔ فرق اگر ہے

تو وہ یقین کی کیفیت میں ہے۔ جب صبح صادق کا ظہور ہوتا اور آفتاب نکلتا ہے نیز دن کی روشنی نمودار ہوتی ہے اس وقت ایک دوسری کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ اور کچھ اور ہی چیز مشاہدہ میں آتی ہے لیکن اصل یقین وہی رہتا ہے۔ ذرا دیکھئے تو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو شاہِ اولیاء، امام اصفیا اور اہلِ کشف و یقین کے استاذ ہیں کیا فرماتے ہیں: لَوْ کُشِفَ الْغِطَآءُ مَا ازْدَدْتُ یَقِیْنًا (خواہ پردہ ہو یا نہ ہو میرا یقین یکساں ہے) یہ ارشاد شاید ان ہی معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے جو کچھ بیان کئے گئے ہیں یعنی ہر چند کہ پردہ درمیان میں ہو لیکن میں اس پردہ سے اسی طرح دیکھ لیتا ہوں گویا پردہ نہیں ہے، اگر پردہ نہ ہوتا اور حقیقت بغیر پردہ کے ظاہر ہوتی تو نہ علم ہوتا نہ کشف اور نہ خبر نہ اثر لَاَحْرَقَتْ سُبُحَاتُ وَجْهِهٖ خواندہ باشی کہ چیست (تم نے پڑھا ہوگا کہ اس کے انوارِ ذات ہر چیز کو جلا ڈالتے کیونکہ یہ انوار اپنی تجلیات میں انتہائی درجے پر پہنچے ہوئے ہیں) ؎

اسرارِ ازل را نہ تو دانی و نہ من	ویں حرفِ معما نہ تو خوانی و نہ من
ہست از پسِ پردہ گفت و گوئے من و تو	چو پردہ بر افتد نہ تو مانی و نہ من

(یعنی ازل کے رازوں کو نہ تو جانتا ہے اور نہ میں۔ اور معمہ کے اس حرف کو نہ تو پڑھتا ہے اور نہ میں۔ میری اور تیری گفتگو پردے کے پیچھے سے ہے۔ جب پردہ اٹھے گا نہ تو رہے گا اور نہ میں)

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

(اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں)

وصل ۷

خیر القرون میں اور اس کے بعد ایمان و یقین کی حالت

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے اور دوسرے دور زمانوں کے بعد کہ ان کو تابعین اور تبع تابعین کے دَور کہتے ہیں اور ان پر خیر القرون کی حدیث صادق آتی ہے نیز اس کا حکم وارد ہوتا

ہے۔ حدیث کے سیاق کے حکم سے جیسا کہ کہا گیا ہے: خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ یَفْشُوا الْکِذْبُ (یعنی سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے اس کے بعد وہ لوگ جو اُن سے ملے ہوئے ہیں اس کے بعد وہ لوگ جو اُن سے ملے ہوئے ہیں۔ پھر ظاہر ہوگا جھوٹ اور جھگڑا)

اختلافات اور جھگڑے آپس میں پیدا ہو گئے اور شر و فساد کے بخارات اُٹھنے لگے، ہر بات میں چون وچرا کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سنت کا نور دھیما پڑ گیا اور بدعت کی تاریکیوں نے دنیا کو گھیر لیا۔ ہر شخص کے دماغ میں اور ہی سودا سمایا اور دل میں مختلف وسوسے اور خیالات پیدا ہوئے۔ تاویل کے دروازے کھل گئے اور نصوصِ قرآنی کے ظاہری معنیٰ متروک ہو گئے۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم کا طریقہ اور سلف کا مذہب کمیاب بلکہ نایاب ہو گیا۔ اَلْاِیْمَانُ بَدَأَ غَرِیْبًا وَ سَیَعُوْدُ غَرِیْبًا فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَاءِ (یعنی ایمان شروع میں تنہا اور بیکس ہوتا ہے اور اس کا انجام بھی یہی ہے کہ غریب و تنہا رہ جائے اور صرف غریب غربا اس پر ثابت قدم رہیں۔)

فلسفہ کا مطالعہ ضعفِ ایمان کا سبب بنا

دینِ اسلام اور سلف کے اعتقاد میں سخت ترین حادثہ اور بدترین مصیبت یہ ہوئی کہ علمِ فلسفہ کا ظہور ہوا اور اس کے بعض خلفائے عباسیہ[1] کے زمانہ میں عربی زبان میں منتقل کیا گیا۔ اس طرح مخالفین کو گویا ایک دستاویز ہاتھ آگئی اور دشمنوں کو جنگ کے لئے ایک ہتھیار مل گیا۔ بعض لوگوں نے تو علم و دانش

---

[1] فلسفہ کی جانب مسلمانوں کی توجہ خلیفہ ہارون رشید کے زمانہ سے ہی ہو گئی تھی، لیکن چونکہ مامون الرشید خود اس علم کا دلدادہ تھا اس لئے اس کے دَورِ خلافت میں اس کی طرف سب سے زیادہ توجہ کی گئی۔ فلسفۂ یونان کی بے شمار کتابیں عربی میں منتقل ہوئیں جنھوں نے دنیائے اسلام میں آزاد خیالی کی ایک لہر دوڑا دی۔ اسی کی بنیاد پر علمِ کلام پیدا ہوا اور اسی نے مسلمانوں میں متعدد لایعنی مسائل و مباحث کو جنم دیا۔

کی حرص اور لالچ میں کہ انسان کا میلانِ طبع ان علوم کی طرف فطری ہے خاص کر جدید علوم کی طرف، جن کو عام طور پر لوگ نہیں جانتے اور بعض حضرات نے عقائدِ اسلام میں مفسدہ پیدا کرتے اور ملت کے قاعدوں کو برباد کرنے کی نیت سے ان علوم میں جو بدعت پر مبنی ہیں غور و خوض کیا اور غلو سے کام لیا ہے، اس لئے تمام علمائے دین اور رہبرانِ ملت، مذہبِ قدیم کی نگرانی اور سنت کی پاسبانی کی غرض سے شریعت کے عقائد کو ثابت کرنے اور فلسفیانہ مسائل کو رد اور باطل کرنے کے لئے کھڑے ہو گئے اور ضروریاتِ وقت کے لئے لازم ہوا کہ وہ ان علوم کو تفصیل سے جانیں، اس لئے کہ کسی چیز کا رد و انکار اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ اس کا اچھی طرح علم نہ ہو۔ پس فلسفیانہ مسائل خوب پھیلے اور کلام و جدال اور بحث و مباحثہ کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ اور بحث و تمحیص کی گرم بازاری ہو کر علمِ کلام وجود میں آ گیا۔ اس سے پہلے بھی علمِ کلام پیدا ہو چکا تھا لیکن اس وقت بحث و مباحثہ سمعیات سے مخصوص تھا۔ اور اس میں اختلاف ان اسلامی فرقوں کے مقابل تھا جنھوں نے اہل سنت و جماعت کے اعتقاد کی مخالفت کی تھی۔

علمِ کلام کی ابتدا

حارث محاسبی[۱] جو شروع زمانے کے فقہا اور مشائخِ طریقت میں سے تھا اس نے اس موضوع پر ایک کتاب تصنیف کی اور امام احمد بن محمد بن حنبل[۲] نے اس سے اس تصنیف کی بنا پر، نیز اس لئے بھی کہ

---

[۱] آپ کا پورا نام شیخ ابو العباس حمزہ بن محمد حارث بن اسد محاسبی ہے۔ ہرات کے متقدمین مشائخ ہیں اور نہایت مستجاب الدعوات تھے۔ ۲۴۱ھ / ۸۵۵ء میں وفات پائی۔

[۲] اسم گرامی محمد بن محمد بن عبداللہ اور کنیت ابو محمد اور ابو عبداللہ ہے۔ امام شافعی کے تلامذہ میں سے ہیں ۱۶۴ھ / ۷۸۱ء بغداد میں پیدا ہوئے وہیں ۱۲ ربیع الاول ۲۴۱ھ / ۸۵۵ء کو جمعہ کے دن انتقال فرمایا۔ مسئلہ خلقِ قرآن کی مخالفت کے سبب آپ کو سخت صعوبتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن آپ راہِ حق سے نہ ہٹے۔ اہل سنت و جماعت کے چار فقہی ائمہ میں آپ کا شمار ہے۔ مسند احمد بن حنبل احادیثِ نبوی کا ایک بڑا مجموعہ ہے۔

اس نے بحث و مباحثہ کا دروازہ کھولا تھا اور مباحثہ کے دائرہ کو وسیع کیا تھا دوری اختیار کی اور اس کی صحبت ترک کردی۔ اور متاخرین میں سے جس شخص نے فلسفیانہ مسائل میں غور و فکر کیا اور اس میں مبالغہ سے کام لیا اور اس (فلسفہ) کو جھٹلایا اور یاجوج کے اس فتنہ کے راستہ میں ایک رکاوٹ پیدا کی وہ امام فخر الدین رازی[1] تھے کہ جنھوں نے فلسفیوں سے دو بدو ہو کر ٹکر لی اور ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اور اگرچہ بعض مباحث میں ان کے یہاں بھی مناظرہ اور مجادلہ کا سا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن چونکہ ان کی نیت سالم ہے اس لئے (یقین ہے کہ) ان کی عاقبت بھی ٹھیک ہوگی۔ اس کے باوجود ارباب کشف میں سے کوئی صاحب[2] عالم رویا میں حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے مشرف ہوئے اور انھوں نے حضورؐ سے امام فخر الدین رازی کے بارے میں دریافت کیا۔ آپؐ نے فرمایا: ذَالِكَ رَجُلٌ مُعَاتَبٌ (یعنی یہ شخص معتوب ہے)۔ اور جب بوعلی سینا[3] کے متعلق پوچھا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: ذَالِكَ رَجُلٌ اَضَلَّ اللّٰہُ عَلٰی عِلْمِہٖ (یعنی یہ وہ شخص ہے جس کو اس کے علم کے باوجود خداوند تعالیٰ نے گمراہ کیا)۔ اور

---

[1] امام فخر الدین رازی ۵۴۳ھ / ۱۱۵۰ء میں رے کے مقام پر پیدا ہوئے۔ اپنے وطن کی نسبت سے رازی کہلاتے ہیں۔ شافعی مذہب کے مشہور امام اور فلسفہ اور الٰہیات کے جید عالم تھے۔ ۶۰۶ھ / ۱۲۱۰ء میں بمقام ہرات فوت ہوئے۔ آپ کی مشہور تصانیف مفاتیح الغیب (تفسیر)، المحصول (فقہ)، اسرار التنزیل (کلام) اور مطالب عالیہ (الٰہیات) ہیں۔

[2] غالباً شیخ جمال الدین جبلیؒ ہیں۔

[3] شیخ بوعلی سینا مسلمان مفکرین اور حکما میں بڑا درجہ رکھتے ہیں وہ ۳۷۰ھ / ۹۸۰ء میں بغداد کے قریب افشنا کے مقام پر پیدا ہوئے اور ۴۲۸ھ / ۱۰۳۷ء میں تہران میں فوت ہوئے۔ مختلف علوم و فنون کے ماہر تھے طب اسلامی کے اساطین میں شمار ہے۔ فلسفہ کے امام سمجھے جاتے ہیں۔ مشرق اور مغرب دونوں ان کے فلسفہ و حکمت کے قائل ہیں۔ تصانیف کی تعداد کافی ہے ان میں شفا فلسفہ کی انسائیکلوپیڈیا اور قانون طب اسلامی کا بیش بہا خزانہ ہے۔

شہاب الدین[1] مقتول کی شان میں فرمایا: هُوَ مِنْ مُتَّبِعِيْهِ (یعنی وہ بھی اسی کا متبع ہے) یعنی وہ بھی بوعلی سینا کا پیروکار ہے۔ اور اللہ بہتر جاننے والا ہے۔

امام غزالی[2] رحمۃ اللہ علیہ بھی اوائل عمر میں فقہا اور متکلمین کے راستہ پر گامزن تھے اور آخر میں ترک و تجرید کے راستے میں آ کر تصوف کے دائرہ میں قدم رکھا اور وہ اس گروہ کے محققین علماء میں شمار کئے گئے اور حجۃ الاسلام کے لقب سے سرفراز ہوئے اور علم تصوف میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ جب ان بزرگ نے ان کی حقیقت حال دریافت کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ذٰلِكَ رَجُلٌ وَصَلَ اِلَى الْمَقْصُوْدِهٖ (یہ وہ شخص ہے جو مقصود تک پہنچ گیا) ہنوز یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان دونوں باتوں میں فرق ہے ایک تو یہ کہا جائے کہ "مقصود سے مل گیا" اور دوسرے یہ کہ "اپنے مقصود تک واصل ہو گیا۔"

علم کلام کے فوائد و نقصانات

اگرچہ اہل اسلام اور ارباب علم کلام کا فلسفیانہ مسائل کے بارے میں غور و خوض کرنا صرف اس لئے ہوتا تھا کہ گمراہیوں کے دلائل کا رد و ابطال کیا جائے۔ اور اس میں اہل حق

---

[1] شیخ شہاب الدین سہروردی مقتول کا اصل نام یحییٰ بن حبش ہے۔ فلاسفہ کے عقائد پر آپ کی زیادہ نظر تھی۔ مشائیین اور اشراقین کی حکمت کے متبحر عالم تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کے عقیدے میں کچھ خلل اور نقص واقع ہو گیا تھا جس کی وجہ سے جب حلب پہنچے تو علماء نے آپ کے قتل کا فتویٰ جاری کر دیا چنانچہ ۵۸۷ھ/۱۱۹۱ء میں آپ کو قتل کر دیا گیا۔

[2] ابو حامد محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ طوس میں ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء میں پیدا ہوئے۔ اسلام کے نہایت مشہور مفکر و متکلم تھے۔ ۴۸۴ھ/۱۰۹۱ء میں نظامیہ بغداد میں مدرس ہوئے۔ ابتداءً آپ کا رجحان فلسفہ کی طرف تھا جس کی وجہ سے مذہبی عقائد سے منحرف ہو گئے تھے۔ لیکن پھر یکایک خیالات میں تبدیلی ہو گئی اور دنیا سے دل اچاٹ ہو گیا۔ آخر عمر گوشہ نشینی میں گذری ۵۰۵ھ/۱۱۱۱ء میں اپنے وطن طوس میں انتقال فرمایا۔ تصانیف میں احیاء العلوم، المنقذ من الضلال، تہافۃ الفلاسفہ اور کیمیائے سعادت زیادہ مشہور ہیں۔

کا فائدہ بھی تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس میں ایک بڑا نقصان بھی ہوا یعنی عقائد میں تذبذب اور دین کے قواعد میں تزلزل پیدا ہوگیا اور اس کی وجہ سے شک اور تردید کا دروازہ کھل گیا۔ چنانچہ بہت کم ایسا ہوگا کہ علم کلام میں غور و خوض اور مبالغہ کرنے کے بعد کوئی شخص حیرت کے دائرہ سے صحیح سلامت نکل آیا ہو اور یقین کی پونجی اپنے ہاتھ سے نہ دے بیٹھا ہو اِلَّا مَنْ عَصِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی وَ ذَالِکَ نَادِرٌ۔ فَاِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (یعنی سوائے اس شخص کے جس کو اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا۔ اور ایسے آدمی بہت کم ہیں پس ہم تو اللہ ہی کا مال ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں)۔

وصل ۳

سلامتی کا راستہ فلسفہ سے اجتناب ہے

سلامتی کا راستہ چلنے والے اور استقامت کے طریقے کے طالب کے لئے ایک ہی راہ ہے وہ یہ کہ "وہ فلسفیانہ مسائل میں غور و خوض کرنے اور اس میں پوری طرح منہمک ہو جانے کو اپنے لئے حرام سمجھے، مباحثوں اور کلامیہ دلیلوں میں مبالغہ کرنے سے اجتناب کرے، بحث مباحثہ کرنے والوں کے ساتھ مناظرہ و مکالمہ میں نہ الجھے۔ صرف اہلِ سنت و جماعت کے عقائد اور ان کے مختصر دلائل پر اکتفا کرے اور اسی اعتقاد کو اپنے دل میں درست اور پختہ کر لے، اور شریعت اور کتاب و سنت کے احکام میں عقل کو دخل نہ دے۔ منقول کو معقول کا تابع نہ بنائے۔ تاویلات اور شک و شبہ کے دروازوں کو بند کر دے، اعتقاد اور اتباع کے راستہ سے باہر نہ جائے اور اپنی کوتاہ سمجھ اور ناقص عقل پر بھروسہ نہ کرے۔ کیونکہ جو شخص بھی گمراہی کے گڑھے میں گرا وہ اسی عقل پر اعتماد اور اپنی رائے پر گھمنڈ کرنے کی بنا پر گرا۔ اگر عقل غیب کے بھیدوں کو سمجھنے اور مبداء معاد کے درست ہوتے اور بگڑنے میں استقلال و استبداد رکھ سکتی تو پھر انبیاء علیہم السلام کے بھیجے جانے اور رسولوں کی بعثت کا کیا مقصد تھا عقل اور حکمت کے پیدا کرنے کی اصل غرض و غایت صرف یہ تھی کہ وہ خدائے تعالیٰ کے

عائد کردہ اوامر و نواہی کو سمجھے اور شریعت کی تکلیف کو برداشت کرے۔ عقل آخر کون ہوتی ہے کہ وہ آخرت کے حالات کی تفصیل اور اعمال کے بھیدوں کی کیفیت اور ان کی تعداد، ان کی وضع قطع ان کے اوقات کا تعین اور ان کی جزا کی خصوصیات، آسمان سے آئی ہوئی وحی کے بغیر معلوم کرلے۔ جبکہ حالت یہ ہے کہ اس معاملہ میں کشف و وجدان تک حیران و پریشان ہیں پھر عقل کس شمار میں ہے جس طرح کہ حس (جزئی چیزوں کے ادراک کی قوت) مدرکاتِ عقل (کلی چیزوں کے ادراک کی قوت) کے سمجھنے سے قاصر ہے۔ اسی طرح عقل، کشف کے بھیدوں کے دریافت کرنے سے معذور ہے۔ اور اسی طرح کشف، وحی اور ایمان کے بھیدوں کا احاطہ کرنے میں بیکار ہے۔ ایمان کے طریقوں میں بہت سی ایسی باتیں معلوم ہیں کہ جو کشف اور وجدان سے دریافت نہیں ہوسکتیں پھر بھلا عقل کا کیا ذکر ہے۔ موجودات میں جو سب سے زیادہ ظاہر ہیں وہ وہ چیزیں ہیں جو محسوس کی جاسکیں اور محسوسات میں سب سے زیادہ ظاہر اور نمایاں اجسام ہیں لیکن متکلمین اور حکماء میں سے تمام عقلمند لوگ ان کی حقیقت معلوم کرنے میں حیران و سرگرداں ہیں چنانچہ ابھی تک یہ پتہ نہیں چل سکا کہ جسم کی حقیقت کیا ہے اور اس کی بناوٹ اور ترکیب کس چیز سے ہوئی ہے۔ آدمی کے قریب ترین شے اس کی اپنی ہستی اور اس کا نفس ناطقہ ہے اور اس کی طرف وہ اشارہ "میں" کے لفظ سے کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "میں نے کیا" "میں نے کہا" اور "میں نے دیکھا" پھر بھی کوئی عقلمند اس بات کا پتہ نہیں چلا سکا کہ یہ کون ہے یا کیا ہے جو کہتا ہے کہ "میں نے کیا" اور "میں نے کہا"۔ اسی لئے کہا گیا ہے ؎

آنکہ خود را شناخت نتواند — آفرینندہ را کجا داند

تو کہ در ذاتِ خود زبوں باشی — عارفِ کردگار چوں باشی

(یعنی جو شخص خود کو نہ سمجھ سکا وہ پیدا کرنے والے کو کیا جانے گا۔ جب تو اپنی ذات کی معرفت میں خوار و زبوں ہے تو تجھ کو معرفتِ کردگار کیسے حاصل ہوسکتی ہے)۔

عقل کو ذات و صفات کا مجملاً ادراک ہوسکتا ہے

تاہم اگر اللہ تعالیٰ کی ہستی کے نور

کے کمال اظہار، اور اس کی صنعتوں کے آثار کی بنیاد پر عقل مجملاً اس کے وجود اور صفات کا کچھ سراغ لگائے تو کوئی بعید از قیاس بات نہیں ہے۔ مگر اس کی صفات اس کے افعال و آثار کی تفصیل اس دنیا میں اور دوسری دنیا میں بے حد و بے حساب ہے لہٰذا سوائے ان خبروں کے جو رسولوں کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہیں کسی دوسری طرح معلوم نہیں کی جاسکتی۔ عقل کے لئے ضروری ہے کہ نبوّت کے طریقوں کے لئے اس کے پاس صرف کان ہونے چاہئیں، آنکھوں کو بند رکھنا چاہیئے اور خاموشی سے بیٹھا رہنا چاہیئے تاکہ معلوم ہو کہ (اللہ کی طرف سے) کیا فرمان آیا ہے اور رسولؐ نے کیا خبر دی ہے۔ اتنا ہی ہونا کافی ہے کہ کان ہوں، آنکھیں نہیں ہیں نہ ہوں۔ اسی لئے علمائے کان کو آنکھ پر فوقیت دی ہے: اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَھِیْدٌ (یعنی جس کسی نے بات کو توجہ کے ساتھ سنا وہی سمجھا جائے گا کہ متوجہ ہے) ے

تا گہر وصف ترا شد صدف سامعہ بر باصرہ دارد شرف

(یعنی جس طرح سیپ (اللہ تعالیٰ کی) تعریف بیان کر کے موتی ہوا۔ اسی (تعریف کی) وجہ سے قوت سامعہ قوت باصرہ پر فوقیت رکھتی ہے)۔

عقل راہِ معرفت میں چراغ کے مانند ہے

عقل مثل چراغ کے ہے کہ اس سے کنوئیں کا راستہ معلوم ہو جاتا ہے۔ چراغ کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ راہ دکھا دے اور اس کے نشانات بتا دے اس سے لوگ دیکھتے ہیں اور ان نشانات کے اوپر چلتے ہیں۔ یہ نہیں کہ چراغ خود راستہ بنائے اور اختراع کرے۔ چراغ سے یہ کام ہرگز ظہور میں نہیں آتا۔ راستہ وہی ہے جو انھوں نے مقرر کیا ہے اور اس کے نشانات ان کے علاوہ دوسرے نہیں ہو سکتے۔ اگر نقل کو عقل کا تابع گردانے لگیں اور جو بات سمجھ میں نہ آئے اور عقل کی اس تک رسائی نہ ہو سکے اس کے لئے تاویلیں گھڑنے لگیں لیکن اس کے مطابق قائل نہ ہوں اور نہ اس پر اعتقاد رکھیں اگرچہ نیک راہ پر بھی چلیں تو بھی یہ ایک طرح سے جھٹلانا اور انکار کرنا ہے۔ پس ایمان کہاں رہا؟ اسلام کیا ہوا؟ ان کے معنی تو قبول کرنا اور اطاعت کرنا ہے۔ کہو لَا اِلٰہَ

اِلَّا اللّٰہ (اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں)

ذرہ آفتاب سے، قطرہ دریا سے، جز کل سے، محکوم حاکم سے، بندہ اپنے پروردگار سے برابری کا دعوای کرے اور کہے کہ تو کون ہے اور کیا چیز ہے کہ جو میں نہیں ہوں۔ واہ ری سمجھ اور واہ ری عقل۔ اگر دنیا کے فرمانرواؤں میں سے کوئی بادشاہ کوئی حکم دیتا ہے یا کوئی بات کہتا ہے اور اس پر لوگ کہنے لگیں کہ یہ حکم ہمارے نزدیک معقول نہیں اور نہ یہ بات ہمارے خیال میں صحیح ہے۔ تو کیا کوئی شخص ایسی بات کہہ سکتا ہے۔ خدا کی پناہ۔ اور اگر کوئی شخص کہتا ہے تو اس کو اپنی اس مخالفت اور اپنے اس انکار کی داد بھی خاطر خواہ مل جاتی ہے۔ یہ ادب کہ جو تسلیم و ترک اعتراض پر مبنی ہے استاد اور مرشد کے لئے بھی مقرر کیا گیا ہے۔ چہ جائیکہ خدا اور رسولِ خدا کے لئے۔ وہ جو کچھ ارشاد فرمائے اس کو سمع و اطاعت سے سننا چاہیئے اور قلب و جوارح سے قبول کرنا اور عمل کرنا چاہیئے تاکہ خود نورِ ہدایت و عنایت باطن کو منور کر سکے اور شک و شبہ کا غلاف ہٹ جائے ؎

ہر چہ نماید کہ بکن آں بکن ۔۔۔ وآنچہ بگوید کہ مگو آں مگو
با سخن او ہمہ تن گوش باش ۔۔۔ وسوسہ بگذار و ز شیطاں مگو

(یعنی جس کام کے لئے تجھ کو منع کیا جائے کہ اس کو نہ کر تو تجھے چاہیئے کہ اس کو نہ کرے۔ اور جس بات کے لئے تجھ سے کہا جائے کہ مت کہہ تجھے چاہیئے کہ وہ بات نہ کہے۔ ان کی بات کو نہایت توجہ سے سُن۔ اور جو کچھ اللہ سے سُنے اس کے متعلق وسوسے اور شک و شبہ میں نہ پڑ۔ کیونکہ وسوسے میں ڈالنا شیطان کا کام ہے)۔

وصل ۴

عقل کی حقیقت اور اس کے اول مخلوق ہونے کا مطلب

اگر لوگ کہیں کہ جو بات تو کہتا ہے یہ تو علما کے قول کے خلاف اور حق کی توہین ہے تو کیا عقل کی فضیلت کے سلسلہ میں یہ نہیں وارد ہوا ہے کہ: اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ الْعَقْلُ (الحدیث) (یعنی پہلی

چیز جو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائی وہ عقل تھی)۔ اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مخلوقات میں پہلی اور افضل شے عقل ہے۔ اور کام کا دار و مدار اس کے ہاتھ میں اور خطاب و عتاب اس کے مطابق ہے۔ نیز یہ تمام گفت و شنید اسی کی بدولت ہے۔ اگرچہ کچھ آیات اور احادیث ایسی ہیں جن کی بنا پر علمانے ظاہری مفہوم کے مقابلے میں عقل کے حکم کے مخالف تاویل اور توجیہ کی ہے اور عقل اور معقول کے مقتضا کی موافقت میں تاویلیں پیش کی ہیں اور مذہب اہلِ حق کہ جس پر تم مطمئن ہو اور جس کو بطور ثبوت پیش کرتے ہو بذاتِ خود یہ ہے کہ عقل علم کے اسباب میں سے ایک سبب ہے اور غور و فکر اور دلالتِ عقلی کی بنا پر چیزوں کو دریافت کرتی ہے اور جس کی عقل کارخانۂ قدرت میں معزول اور مردود مطلق ثابت ہوتی ہے اور وہ شخص بات بھی عقل کی مدد سے معلوم نہیں کرسکتا اس کی بات قطعاً باطل اور اس کا مذہب ایک باطل پرست کا مذہب (گمراہ کا مذہب) سمجھا جاتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ "اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْعَقْل" (یعنی سب سے پہلی شے جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی وہ عقل تھی) والی حدیث جو تم نے پیش کی ہے، اس سے مراد مخلوق اول اور وجود ثانی ہے۔ کہ اسی کو عقلِ اوّل، روحِ اعظم اور قلمِ اعلیٰ کے ناموں سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ اور اربابِ کشف و وجدان کی دریافت اور اہلِ دین و ایمان کے اعتقاد کے مطابق وہ عین حقیقتِ محمدیؐ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح اقدس ہے کہ عالمِ امر میں اس پیدائش کی صورت میں وہ روح اقدس انبیاء علیہم السلام کی نبی اور تمام روحوں کی محافظ تھی۔ اور عالم عنصریہ خلقیہ کے ظہور کے بعد وہی جوہر کل آپ کے جسم اطہر سے متعلق ہو کر اور مدبرؔ متصرف بن کر اہلِ عالم کی تکمیل کا سبب تھا۔ یہ خود ہمارے مقصود کے موافق بلکہ عین ہمارا مدعا ہے۔ اس لئے کہ یہ روحیں اور جزئی عقلیں جو افرادِ انسانی کے جسموں سے متعلق ہیں سب کی سب اس عقلِ کل اور روحِ اعظم سے فیض اور فائدہ حاصل کر رہی ہیں۔ اور یہ روحِ اعظم اور عقلِ کل، فیوض کا خزانہ اور انوار و تجلیات کا منبع

ہے اور تمام روحیں اور عقلیں درحقیقت اسی کے نور کی کرنوں میں سے صرف ایک کرن کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کی مثال آنکھوں کی سی ہے کہ جب ان کی نسبت جرم آفتاب سے قائم کی جائے تو جب تک آفتاب کی روشنی نہ چمکے اور اپنا پرتو نہ ڈالے اس وقت تک آنکھوں میں دیکھنے کی روشنی پیدا نہیں ہوتی اور کوئی چیز ظاہر نہیں ہوتی پس عقلوں کا نور نبوت کے ساتھ برابری کا دعویٰ، یا ایک دوسرے کے مد مقابل ہونا کوئی معقول بات نہیں ہے چنانچہ آنکھ کی آفتاب کے ساتھ برابری کا کوئی امکان موجود نہیں ہے اور اس بات سے بھی اگر قطع نظر کرلی جائے تب بھی عقل کی فضیلت اور اعتبار میں کسی کو کلام نہیں ہوسکتا کیونکہ خطاب (بات) کے سمجھنے اور ثواب و عذاب کے استحقاق کا دار و مدار اسی پر ہے اور معاش و معاد کے اچھے اور برے طور طریقے جو صاحبِ شریعت (آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بتائے ہوئے ہیں ان کی معرفت کلیتہً اسی کے لئے ہے چنانچہ متعدد آیتیں، حدیثیں اور اخبار و آثار اس کی فضیلت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔ یہ جو بعض آدمیوں نے اس کو علم سے بھی افضل قرار دیا ہے اور علم پر اس کو ترجیح دی ہے ممکن ہے کہ بعد تحقیق وہ بات صحیح ثابت ہوجائے۔ کیونکہ آخرکار اللہ تعالیٰ کی معرفت اور شناخت اور بندہ کے جنابِ احدیت میں پہنچنے کے لئے یہی دو طریقے ہیں یا ذکر کا طریقہ ہے یا فکر کا۔ بعضوں نے فکر کے طریقہ کو اصل بتایا ہے۔ اور اس کی معرفت کے دفتروں کا دستور قرار دیا ہے، ان کے نزدیک تَفَکُّرُ سَاعَةٍ خَيْرٌ مِّنْ عِبَادَةِ سَنَةٍ (یعنی ایک ساعت غور و فکر کرنا ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے) اور ایک اور جگہ کہا گیا ہے: مِنْ عِبَادَةِ سِتِّيْنَ سَنَةٍ (یعنی ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے) اور یہ فرق غور و فکر کے مدارج کے فرق کے مطابق ہوتا ہے۔ اب اس بارے میں کہ ہر شخص کے غور و فکر کی رسائی کس حد تک ہے۔ مولانا جلال الدین[1] رومی قدس سرہ فرماتے ہیں ؎

---

[1] مشہور صوفی بزرگ، فرقہ مولویہ کے سرخیل۔ مثنوی معنوی کے مصنف پیدائش ۶۰۴ھ / ۱۲۰۷ء وفات ۶۷۲ھ / ۱۲۷۳ء مزار ترکی کے شہر قونیہ میں ہے۔

ایں قدر گفتیم باقی فکر کن — فکر اگر جامد بود رو ذکر کن

(یعنی ہم نے اتنا کچھ بتا دیا ہے اب تو خود غور و فکر کر، اور اگر غور و فکر کی صلاحیت معطل ہو جائے تو پھر منعم حقیقی کو یاد کر)

ذکر و فکر کا فرق

کہا جاتا ہے کہ ذکر سے انسان عاشق بنتا ہے اور فکر سے عارف. اور ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ذکر و اشرف و افضل گردانتا ہے. اس لئے کہ وہ حق تعالیٰ کی صفت ہے (جیساکہ وہ خود فرماتا ہے) فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ (تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا) اور فکر بندہ کی صفت ہے اور یہ بات یقینی ہے کہ جو صفت مولیٰ کی ہے وہ اس صفت سے جو بندہ کی ہے افضل ہے. ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ ذکر خدا کی ذات سے متعلق ہے جیسے کہ فرماتا ہے: اُذْکُرُوا اللّٰہَ ذِکْرًا کَثِیْرًا (یعنی اللہ تعالیٰ کا ذکر زیادہ سے زیادہ کرو) اور فکر صرف اللہ تعالیٰ کی صفات میں ہی کیا جاتا ہے جیساکہ (ارشادِ نبویؐ ہے) تَفَکَّرُوْا فِی الْآلِہٖ وَلَا تَفَکَّرُوْا فِیْ ذَاتِہٖ (یعنی اس کی نعمتوں کے بارے میں غور کرو، ذات کے بارے میں غور و فکر نہ کرو) قصہ مختصر یہ کہ راستہ بغیر فکر کے نہیں کھلتا اور فکر خود کار عقل ہی ہے. لہٰذا عقل کو خدا کی معرفت کے سلسلہ میں پورا دخل اور بلند پایہ نصیب ہے لیکن مقصود یہ ہے کہ عقل کو دین کے معاملات میں اور حق الیقین کے مرتبہ پر مطلق دخل نہیں ہے اور وحی آسمانی کے مخالف ہے. وہ شارع علیہ السلام کے حکم کے برابر اور مقابل میں علم نہیں رکھتی البتہ شارع علیہ السلام کی تعلیم کی معرفت رکھتی ہے. لہٰذا اس کی تعریف میں غور و فکر کرنا چاہیئے. یعنی جو کچھ فرمایا ہے، جس طریقہ پر فرمایا ہے اور جو آداب ظاہر کئے ہیں ان سب باتوں کو سوچنا ضروری ہے. اہلِ تقلید اور اہلِ تحقیق کے مراتب اسی طرح باقی ہیں: فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ (یعنی پس عبرت حاصل کرو اے اہلِ بصر!)

معقول و منقول کی صحیح تطبیق

آیتوں اور حدیثوں میں تصرف اور تاویل جو علماء کرتے ہیں اور ان کو معقول کے ساتھ تطبیق دیتے ہیں. یہ بھی اسی وجہ سے ہے. وہ معقول کہ جس پر منقول کو تطبیق دیا

جائے اس صورت میں معقول اور صحیح ہے جب وہ شریعت کے قوانین اور دین کے معلوم و مقررہ احکام کے مطابق اور تتبع میں ہو لیکن جو بات کہ محض معقول میں یعنی جو چیز ہماری ناقص سمجھ اور قاصر عقل میں ہی آئے۔ اور شارع علیہ السلام کے ارشادات میں توقف (ڈھیل دینا) اور ایک ایسی بات پر اعتقاد ہو جو باطن میں نفاق و انکار ہے، قطعاً نامعقول ہے۔ فلاسفہ جنھوں نے شروع میں فلسفہ کی ملمع کی ہوئی چیزوں کو اپنایا اور اپنا شعار بنا لیا تھا کسی طرح بھی سچے مسلمان نہیں ہو سکتے تھے اور اس آیت اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ (یعنی پوشیدہ طور پر دینِ خالص کے لئے کوشش نہیں کرتے تھے) نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذَالِكَ (یعنی اس بات سے اللہ کی پناہ)

اب تک جو تقریر اور بحث کی گئی ہے اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ اہلِ حق کے مذہب کے مطابق، عقل، اسبابِ علم میں سے ہے اور مقصود میں علم سے تناقض نہیں رکھتی۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ وَعِلْمُهٗ اَحْكَمُ (اور اللہ ہی سب سے زیادہ جاننے والا ہے اور اسی کا علم سب سے زیادہ صحیح ہے)۔

وصل ۵

نبی کی سچائی کو سمجھنے کے لئے عقل کی نہیں بلکہ ھدایت کی ضرورت ہے

کہا جاتا ہے کہ عقل ہونا چاہیئے تاکہ اس سے نبی کی سچائی، اس کے معجزات کے بارے میں فکر و نظر کے ذریعے سمجھی جا سکے۔ اور عقل کے سوا اس کو کسی اور طریقے سے نہیں معلوم کیا جا سکتا۔ بس عقل ہی اصل ہے۔ خدا کی قسم یہ بات نہیں ہے بلکہ ہدایت ہونی چاہیئے تاکہ نورِ توفیق حاصل ہو اور منزلِ مقصود تک رسائی ہو سکے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو چند کفارِ قریش ایسے تھے جو کافی عقلمند تھے اور وہ اپنے کاموں میں دقتِ نظر کا اظہار کرتے تھے۔ لیکن انوارِ معجزات کا جو بالکل واضح ہے مشاہدہ کرنے کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کو نہ سمجھ سکے۔ اور اگر انھوں نے سمجھ بھی لیا تو حسد اور تکبر

عناد کے سبب کفر اور تکذیب کی راہ پر چل پڑے۔ آخر انھوں نے عقل سے حسد اور تکبر اور عناد نیز ان کے نتائج کی خرابی اور ان کے اجتناب کے طریقے کو کیوں نہ سمجھ لیا اور وہ اس سے راہِ ست کی جانب کیوں نہ چلے اور اپنی عقل اور سمجھ سے کوئی ایسی تدبیر کیوں نہ اختیار کی اور ایسے قواعد و قوانین کیوں نہ مرتب کئے کہ ان کے آبا و اجداد کے دین و ملت کے قاعدے کہ جن پر صدیاں گذر گئی تھیں ختم ہو سکتے۔ ان کے علاوہ اُس زمانے میں اور اس کے بعد بعض وہ عقلاء حکماء امرا اور سلاطین کہ جن کی حکمت و سلطنت کی چہار دانگِ عالم میں دھوم تھی اور جن کا شہرہ آسمان تک پہنچ رہا تھا اپنی عقل و دانش کے زور سے دین و ملتِ اسلامیہ کے ظہور میں کیوں مانع نہ ہو سکے۔ اور اگر ان میں سے بعض ایسے تھے جو اپنے نفس کے غرور اور ہوس کے غلبہ کے سبب اس خواہش کو دل میں جگہ دیئے ہوئے تھے یا انھوں نے یہ خیال قائم کر رکھا تھا اور وہ قواعد اور قوانین ایجاد کر لئے تھے تو پھر وہ قواعد و قوانین ان کے بعد کیوں باقی نہیں رہے اور انھیں رواج کیوں نصیب نہ ہو سکا۔ اس بات سے یہ معلوم ہو گیا کہ نبوت ایک دوسری چیز ہے، اور سلطنت دوسری شے ہے۔ میں نے اس بات کو ایک اور رسالہ میں جو اثباتِ نبوت[1] کے بارے میں لکھا گیا ہے (اس میں میں نے) بیان کیا ہے کہ اثباتِ نبوت کیا چیز ہے اور کون شخص ہے کہ وہ نبوت کو ثابت کر سکے؟ نبوت تو خود ہی وہ شے ہے جو تمام چیزوں کو ثابت کرتی ہے۔ یہ بات اسی طرح زبان زدِ عام ہو گئی اور عادت بن گئی ہے چنانچہ اس کو اثبات واجب کہا جاتا ہے۔ اپنا مقصود معلوم ہے کہ کیا ہے لیکن جو بات کہ عقل اور عقلا کے خیال میں مجنونوں کی طرح سرزد ہوتی ہے اس کو وہ لوگ معذور سمجھتے ہیں۔

عقل کا صحیح مصرف

مجھے خوف ہے کہ بات طول کھینچ رہی ہے اور میں اپنے مقصد سے دُور ہوتا جا رہا ہوں۔ مقصود اصلی یہ ہے

---

[1] "اثباتِ نبوت" نامی ایک عربی رسالہ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کی تصنیف سے ہے جس کو اصل متن عربی مع اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ ادارہ مجددیہ۔ ناظم آباد ۲ کراچی ۱۸

کہ عقل ایک نعمت ہے اور اس نعمت کا شکر ادا کرنا چاہیئے اور عقل جیسی نعمت کا شکر ادا کرنا یہ ہے کہ غلط راہ پر نہ پڑے۔ تصدیقِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں تفکر کرے اور رسالت کے کاموں میں آپ کے احکام کی متابعت کرے۔ اس کی مخالفت میں کوئی بات نہ کہے، اور ایمان کی سعادت سے محروم نہ ہو۔ کس قدر بد قسمتی اور بد بختی ہے کہ کسی کے سامنے خوان الوانِ نعمت پھیلایا اور پیش کیا جائے اور وہ شخص اس قسم کے شک اور تردد اور بحث و جھگڑے میں جا پڑے کہ اس کھانے کی حقیقت کیا ہے۔ اس کو کون لایا ہے، کہاں سے لایا ہے، اس سے سیری ہو سکے گی یا نہیں۔ اس کی کوئی حقیقت ہے یا نہیں۔ اسی قسم کے بیہودہ اور خام خیال میں پھنس کر حیران و درماندہ ہو جائے اور دوسرے لوگ آئیں، ان نعمتوں کو کھا جائیں اور خوب لطف اٹھائیں، اور وہ خود محروم رہ جائے اور اسی طرح بھوکا مر جائے۔ یا پھر یہ کہ سورج طلوع ہو اور اپنی روشنی سے تمام دنیا کو گھیرے (یعنی سورج کی روشنی تمام عالم میں پھیل جائے) اس وقت کوئی شخص اپنی آنکھ بند کرلے اور بحث و تحمیص میں پڑ جائے اور یہ تحقیق و تفتیش کرنے لگے کہ اس کا یہ نور کہاں سے آیا ہے، وہ حق ہے یا باطل، اور حقیقت ہے یا محض خیال ہی خیال ہے، اور اس طرح اس عالمگیر نور سے روشنی نہ حاصل کرے اور ظلمت ہی میں رہے اور بھٹکتا ہی پھرے اور اسی طرح ناکامی و نامرادی کے کنوئیں میں گر کر جان دے دے۔ ایسی عقل کس کام کی اور ایسی سمجھ سے کیا فائدہ۔ اس سے تو بہتر دیوانگی ہی ہے ؎

زیں خرد بیگانہ می باید شدن — دست در دیوانگی باید زدن
آزمودم عقل دور اندیش را — بعد ازیں دیوانہ خواہم خویش را

(یعنی ایسی عقل سے بیگانگی اختیار کرنا بہتر ہے۔ اور دیوانگی میں ہاتھ مارنا چاہیئے۔ میں نے عقل دور اندیش کو جب آزمایا، اس کے بعد میں نے خود کو دیوانہ بنا لیا)۔

وصل ۶۷

عقل اشیاء کے کنہہ و حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہے

اگر عقل چیزوں کی حقیقت کے سمجھنے اور موجودات کے احوال کی معرفت میں مضبوط و مستحکم ہے تو پھر دنیا بھر کے عاقل اور عالم چیزوں کی خاصیت کے اسباب بیان کرنے میں کیوں عاجزی اور نادانی کا اعتراف کرتے ہیں۔ مثلاً کہربا میں قوتِ کشش اور سقمونیا میں اسہال کا سبب بننے کی صلاحیت کیوں ہے اور آخر ش یہ نتیجہ نکلا کہ یہ ان چیزوں کی صورتِ نوعیہ کا اقتضا ہے کہ ان ہی سے ان چیزوں کی تعیین و تشخیص کی جاسکتی ہے۔ کیا بات ہے اس علم کی سوائے اس کے کہ یہ پچھلے جہل کی تلافی کر دیتا ہے اور بس۔ ایسی صورت میں یہی جو کہو کہ خدائے تعالیٰ نے اس کو ایسا ہی پیدا کیا ہے اور اس میں یہ خاصیت رکھ دی ہے۔ اس کے علاوہ اور کیا بات ہے اور اگر اس سلسلہ میں تمھارے پاس اُس کے کسی بھیجے ہوئے انسان کی کوئی اطلاع یا اثر ہے تو اس کو سمجھو اور اس پر اعتقاد رکھو، اور بیکار کی عقل کو چھوڑ دو۔ اور جب اس مسئلہ میں اپنی عجز و نادانی کا اعتراف کر لیا ہے تو سب جگہ ایسا ہی کرو۔ بیچارہ سلمان[1] شاعر کہ جو اپنے نام اور وطن کی وجہ سے

---

[1] خواجہ سلمان ساوجی کا باپ خواجہ علاء الدین ایک ذی وجاہت شخص تھا اس لئے اسے تعلیم اچھی ملی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد شاعری کی طرف مائل ہوا اور بہت جلد اس قدر کمال حاصل کر لیا کہ سلطان اویس ایلخاں کا مصاحب خاص بن گیا۔ بادشاہ کے بڑے بیٹے خواجہ اویس نے اس کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ سلمان ساوجی کے کلام میں وہ حلاوت و بلاغت تھی کہ اس کی بنا پر وزیر سلطنت علاء الدولہ سمنانی نے ایک مرتبہ کہا تھا: "سمنان کی دو چیزیں بے نظیر ہیں ایک انار سمنان دوسرا شعر سلمان"۔ مولانا جامی بھی اس کی شاعری کی وجہ سے اس کے بے حد قدر دان تھے۔ سلمان کا انتقال ۷۶۷ھ ۱۳۶۶ء میں ہوا۔

حضرت سلمان[1] فارسی کی یاد دلاتا ہے کتنی اچھی بات کہتا ہے ؎

علومِ غیب اگر ہستی علومِ غیب را دانا
وما اوتیت می خوانی ومی گوئی کہ می دانم

مگو تا آتشِ خورشید رخشاں از چہ شد حربا
بگو تا فتنہ بر آتش چرا گردید پروانہ

(یعنی تم پڑھتے تو ہو کہ تمہیں بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے اور کہتے یہ ہو کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں اگر واقعی تمہیں غیب کا علم ہے تو بتاؤ کہ پروانہ آگ پر اس درجہ فریفتہ کیوں ہے اور یہ بھی بتاؤ کہ آخر حربا نام کا جانور جو سورج کا عاشق ہے اس کے ساتھ ساتھ کیوں گھومتا رہتا ہے)۔

دینِ اسلام نے کس طرح لوگوں کے درجے بلند کئے

یہ سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ دو سو پچاس سال سے زیادہ (عمر میں) پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طلب میں نکل کھڑے ہوئے۔ انھوں نے دنیا بھر کا چکر لگایا اور مختلف دینوں میں داخل ہوئے اور یہودیوں اور عیسائیوں کے جال میں پھنسے اور کئی جگہ فروخت بھی ہوئے لیکن آخر میں مقصودِ اعلیٰ تک پہنچ گئے۔ سبحان اللہ۔ وہ ایک ہی اطلاع پاکر اس درجہ والا و حیران ہوئے لیکن اب ہزارہا اخبار سامنے ہیں اور کوئی شخص ان پر کان نہیں دھرتا اور ایک قدم بھی آگے کی طرف نہیں اٹھاتا۔ ہائے ری غفلت۔ سلمانؓ ایک بندہ ہے لیکن اس نے تمام ایرانیوں کے جگر پر غیرت اور حسرت کا داغ قائم کر دیا ہے خواہ

---

[1] حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجوسی النسل تھے۔ تلاشِ حق میں انھوں نے بہت سے سفر کئے، سخت تکلیفیں اٹھائیں۔ مختلف مذاہب اختیار کئے اور کئی آقاؤں کی غلامی میں رہے۔ آخر ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر دولتِ اسلام سے مشرف ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں مدائن کے گورنر رہے، اور وہیں ۳۵ھ (۶۵۶ء) میں انتقال فرمایا۔ ان کی عمر ڈھائی سو سال اور بعض روایتوں کی بنا پر ساڑھے تین سو سال بتائی جاتی ہے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت انسؓ جیسے صحابہ نے روایت کی ہے۔

ان میں نوشیرواںؔ[1] ہو یا خسروؔ[2]۔ اسی طرح سے صہیبؔ[3] رومیؓ کا ستارہ قیصرِ رومؔ[4] کو رشک میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اور بلالؔ[5] حبشیؓ کے بارے میں میں خود کہہ سکتا ہوں کہ وہ

---

[1] ایران کے ساسانی خاندان کا مشہور فرمانروا جو اپنے عدل و انصاف کی بنا پر نوشیرواں عادل کہلاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے وقت ایران میں اسی بادشاہ کی حکومت تھی۔ اسی بادشاہ کے زمانہ میں مزدکیت کا خاتمہ ہوا۔

[2] خسرو پرویز ساسانی خاندان کا وہ فرمانروا تھا جو اپنی شان و شوکت کی وجہ سے ضرب المثل ہوگیا ہے۔ اسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام پیش کیا لیکن اس گمراہ نے آپ کا نامۂ مبارک چاک کر دیا اور آپؐ کی گرفتاری کا حکم دیا۔ لیکن چند روز بعد اپنے بیٹے شیرویہ کے ہاتھ سے جہنم واصل ہوا۔

[3] حضرت صہیب بن سنان رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں۔ ان کی کنیت ابو یحییٰ تھی۔ شہر موصل کے رہنے والے تھے۔ ایک حملہ کے دوران رومی ان کو گرفتار کر کے لے گئے۔ اس وقت ان کی عمر بہت کم تھی۔ اس لئے ان کی نشوونما روم میں ہوئی اور وہ صہیبؓ رومی کے نام سے مشہور رہے۔ بنو کلب نے ان کو رومیوں سے خرید کر عبداللہ بن جدعان کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ جب حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کر لیا تو قریش نے ان کو بڑی تکلیفیں پہنچائیں۔ چنانچہ انھوں نے مدینہ کو ہجرت کی و میں ۳۸ھ / ۶۹۹ء میں ان کا انتقال ہوا۔ جنت البقیع میں آسودہ ہیں۔ آپؓ سے بہت لوگوں نے روایت کی ہے۔

[4] سلطنت روما کے شہنشاہوں کا لقب قیصر ہوتا تھا۔ پہلا قیصر جولیس سیزر تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مشرقی سلطنت روما کا شہنشاہ قیصر ہرقل ہوا ہے اسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام پیش کیا لیکن اپنی ازلی بدبختی کے سبب وہ اس دولت بے بہا کو قبول نہ کر سکا۔

[5] حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ یہ ان لوگوں میں تھے جو شروع زمانے میں ایمان لائے اور جنھوں نے راہِ خدا میں سخت اذیتیں اٹھائیں۔ سب کے ساتھ مدینہ کی جانب ہجرت کی۔ بدر اور دیگر غزوات میں شریک ہوئے۔ مسجدِ نبویؐ کے مؤذن تھے۔ آواز میں بے حد درد تھا۔ آخر عمر میں دمشق میں رہنے لگے وہیں ۲۰ھ / ۶۴۱ء میں انتقال ہوا۔

دین اسلام کے رخسار کا ایک خال مشکیں ہیں۔

سرور کائنات ﷺ کا ارشادِ گرامی

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اَلسَّبَّاقُ اَرْبَعَۃٌ اَنَا سَابِقُ الْعَرَبِ (الحدیث) (یعنی سب پر سبقت لے جانے والے چار ہیں میں سابق العرب ہوں) آپؐ کا ارشاد ہے کہ اس راہ کے سبقت لے جانے والے کہ جس راہ پر چل کر اللہ کی درگاہ میں پہنچتے ہیں اور جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مِنْھُمْ مُقْتَصِدٌ وَمِنْھُمْ سَابِقٌ بِالْخَیْرَاتِ (یعنی ان میں وہ لوگ ہیں جو درمیانی راہ پر چلتے ہیں اور اچھی باتوں میں سبقت لے جاتے ہیں)۔چار ہیں۔ میں عرب کا سابق ہوں، دوسرے سلمانؓ ہیں جو فارس کے سابق ہیں، اس کے بعد صہیبؓ روم کے، اور بلالؓ حبشہ کے ہیں۔

یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میری روح آپؐ پر قربان! یہ آپؐ نے کیا بات فرمائی ہے اور یہ کیسی رحمت اور تواضع ہے اور کس قدر شرف و اکرام ہے کہ جو آپؐ فقیروں اور غریبوں کو عنایت فرما رہے ہیں اور خود کو ان ہی میں شمار کر رہے ہیں۔ آپؐ تو سب پر سبقت لے جانے والے ہیں۔ آپؐ ہر جان کی جان ہیں۔ آپؐ کو کسی سے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ اور کوئی شخص آپؐ کی کسی بات میں کیسے شریک ہو سکتا ہے۔ درحقیقت آپؐ اپنے پروردگار کی جانب سے مامور ہیں کہ فقیروں کی صحبت اختیار کریں اور ان کے ساتھ بیٹھیں۔ وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ (یعنی آپؐ خود کو ان کے ساتھ منسلک کریں کہ جو اپنے پروردگار کی یاد میں لگے رہتے ہیں)۔

بدرویشاں و مسکیناں سرے است　　　　بلا خوش باش کاں محبوب جاں را

(یعنی اس امر سے آگاہ اور خوش ہو کہ ہمارا محبوب درویشوں اور مسکینوں کا خیال رکھتا ہے)

خدا جانتا ہے کہ فقیروں کی قدر و عزت سے ان کو کیا بات ظاہر ہوئی ہے کہ جس کی وجہ سے ان کی یہ سب خاطر داری ہو رہی ہے: لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ان (تین غلاموں) میں سے کسی ایک سے کچھ نزاع ہو گئی اور حضرت صدیق اکبرؓ نے ان کو کچھ سخت بات کہہ دی۔

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس واقعہ کو دُہرایا۔ آپؐ نے فرمایا "اے ابو بکر! سمجھو سمجھو۔ جلدی جاؤ، ان کی دلجوئی کرو، ان سے معذرت چاہو، اور معافی مانگو۔ اگر تم نے ان میں سے ایک کو بھی رنجیدہ کر دیا تو یقین مانو کہ تم خداوندِ عرشِ عظیم کو رنجیدہ کر دو گے۔"

اسلام سے تعلق یا عشق

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ حالت تھی کہ اگر ان سے پوچھا جاتا تھا کہ "تمھارا حسب نسب کیا ہے؟" تو وہ کہتے "میرا نسب اسلام ہے"۔ اگر ان سے کہا جاتا "تمھارے باپ کون ہیں؟" تو وہ کہتے: "میرے باپ اسلام ہیں۔ جب میرا دین ہی اسلام ہے تو میری ہر چیز اسلام ہے۔ آخر یہ دین ہی تو ہے جو ماں باپ، بھائی اور ہر اس شخص سے جس کو عزیز تر کہا جاتا ہے زیادہ قریب ہے۔"

صحابہ کرامؓ میں بعض حضرات ایسے تھے جنھوں نے اسلام کی خاطر اپنے ہاتھوں، بھائیوں اور عزیزوں کو قتل کر دیا تھا اور اس طرح اپنے عشق و محبت کا ثبوت دیا تھا۔ تمھیں چاہیئے کہ تم بھی ایسے ہی ہو جاؤ تاکہ تمھیں کچھ فائدہ پہنچے اور تم سے ریا کا عنصر خارج ہو جائے۔ چنانچہ حضرت سلمان فارسیؓ کے بارے میں اس طرح کی حدیث آئی ہے: لَوْ كَانَ الْعِلْمُ اَوِالدِّيْنُ مُعَلَّقًا بِالثُّرَيَّا لَنَالَهٗ رَجُلٌ اَوْ رِجَالٌ مِنْ فَارِسٍ (یعنی اگر علم آسمانوں میں ہو تو ہر صورت میں فارس کا کوئی شخص یا فارس کے کچھ اشخاص ہی اس کو حاصل کریں گے)۔ اگر روایت میں "رجل" ہے تو اس سے مراد حضرت سلمانؓ کی ذات ہے۔ اور اگر "رجال" ہے تو اس سے ان کی اور ان جیسے لوگوں کی طرف اشارہ ہے (لہٰذا) تم بھی ایک بندے ہو۔ آؤ اور ایمان لاؤ اور اعتقاد کو مضبوط کرو، وہ تمام چیزوں کی تعلیم تمھیں دیں گے۔ مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ اَوْرَثَهُ اللّٰهُ عِلْمَ مَالَمْ يَعْلَمْ (یعنی جس شخص نے اس چیز پر عمل کیا جس چیز کا علم اسے ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کو وہ چیز دیتا ہے جس کا اسے علم نہیں ہے)۔

علم بقدرِ استعداد عطا ہوتا ہے

یہ تمام باتیں جو تم جانتے ہو مگر بغیر تعلیم کے جانتے ہو اور تعلیم کے بعد تمہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ امر معقول اور ممکن ہے۔ حالانکہ بغیر تعلیم اور تعریف کے وہ بات محال ظاہر ہوتی ہے۔ محال وہی ہے کہ جس کی تعلیم نہیں کی گئی اور جس کی فہم اور سمجھ نہیں دی گئی۔ پس لوگ اس کے جاننے سے ناامید ہو کر بیٹھ گئے اور اس کو محال سمجھ بیٹھے تو تم ناامید ہو کر نہ بیٹھو۔ اگر خود کو پوری طرح اس کے سپرد کر دو گے تو وہ سب باتوں کی تم کو تعلیم دے دے گا لیکن استعداد اور قابلیت کے بقدر، کہ یہ استعداد و قابلیت بھی اسی کی بنائی ہوئی ہے اور تخلیق کی ہوئی ہے نہ ماہیت کے مقتضا سے ہے اور نہ مزاج اور طبیعت کے تابع ہے۔

یہاں سے پھر راستہ ظلمت آباد فلسفہ کی طرف جاتا ہے (بہرحال تم) نیک ہو تاکہ بھٹکتے نہ پھرو۔ ہمیشہ آفتابِ نبوتؐ اور بابِ رحمت کے مقابلے میں گردن جھکائے بیٹھے رہو اور حال یا قال کی زبان سے تضرع وزاری کے ذریعے انوارِ رحمت سے فیض حاصل کرو، اس جگہ سے تمہارے دل پر روشنی پڑے گی کیونکہ اس روشنی سے سینہ روشن و منور ہو جاتا ہے اور اس کی تجلی سے ایمان بالغیب کی صورت پیدا ہوتی ہے: اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ (یعنی جس کسی کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے کھول دیا ہے اس کو اللہ کے رب کی جانب سے روشنی پہنچتی ہے)۔ کوئی شخص آفتاب کے بالمقابل بیٹھا رہے اور پھر بھی روشنی نہ پائے اور نہ گرمی محسوس کرے تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے، اور اس آفتاب (رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو یہ ہے کہ) اگر وہ چاہیں تو اتنی حرارت پہنچائیں کہ آگ ہی آگ ہو جائے اور ان کے سوا جو چیز ہو وہ جل بھن کر خاک ہو جائے۔ اس وقت پتہ چل جائے کہ وہ حجت اور تاویل جو آفتاب کی نورانیت اور اس کے جلال و سطوت کے بارے میں کی گئی تھی کہاں چلی گئی

مصطفٰے اندر میاں آنکہ کسے گوید دعقل　　آفتاب اندر جہاں آنکہ کسے گوید سہا

(یعنی کوئی شخص عقل کی مدد سے حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام کو سمجھنا چاہے تو یہ ایسا ہی ہے جیساکہ جب آفتاب چمک رہا ہو تو کوئی شخص ستارہ سہا[1] کو تلاش کرے)۔

وصل ۷

نورِ حقیقت دل کی آنکھ سے دیکھا جاسکتا ہے

بات ذرا طویل ہوگئی اور کہیں سے کہیں جا پہنچی، گویا اس نے ایک دوسرا رنگ پیدا کر دیا، اور ایک اور روشنی اس پر پڑنے لگی، تاہم مطلع صاف ہوگیا اور خورشیدِ حقیقت ابر کے گوشہ سے نمودار ہوا اور صحیح مرکز پر توجہ قائم ہوگئی۔ اس سب کو اس نور کا فروغ سمجھنا چاہیئے کہ جس نے خیال کے روزن (سوراخ) سے پرتو ڈال کر سینہ کو روشن کر دیا ہے۔ اس نور کو محض دل کی آنکھوں سے پایا جاسکتا ہے، ظاہری آنکھوں سے نہیں دیکھا جاسکتا۔ لیکن حال کے غلبہ سے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ظاہری آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور جو لوگ محجوبان اہل زمانہ ہیں ان کو یہیں سے شبہ (اشتباہ) ہوجاتا ہے اور وہ کہنے لگتے ہیں کہ ہم حقیقت کو ظاہری آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور دوسروں کو بھی دکھلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی پناہ! پہلے لوگوں میں سے کسی نے بھی اس بے باکی سے گفتگو نہیں کی۔ بات حقیقت میں وہی ہے جو اربابِ تمکین میں سے بعض محققین نے قرار دی ہے اور قانون بنا دیا ہے اس

---

[1] ثابت ستاروں کے مشہور و معروف مجموعہ بنات النعش کبریٰ میں سات روشن ستارے اس ترتیب سے قائم ہیں کہ اگلے چار ستاروں سے ایک پیالہ بن جاتا ہے اور پچھلے تین ستاروں سے اس پیالہ کا دستہ تیار ہوتا ہے۔ دستے کے تین ستاروں میں سے بیچ کے ستارے کے قریب ایک بہت دھندلا ستارہ واقع ہے جو بہت غور سے دیکھنے پر نظر آتا ہے۔ یہ ستارہ سہا یا انخوار کہلاتا ہے۔ جب معمولی ستاروں کے مقابلہ میں اس ستارہ کی روشنی اس قدر مدھم ہے تو آفتاب کے مقابلے میں اس کی کیا حقیقت ہوسکتی ہے۔ اس بات کو سامنے رکھ کر دیکھیے تو تشبیہ نہایت مکمل اور بلیغ معلوم ہوگی۔

کے علاوہ جو کچھ ہے وہ تمام کا تمام یا غلبۂ حال کی وجہ سے ہے یا محض ان کا دعویٰ ہے۔
چنانچہ تعریف میں فرمایا ہے کہ لَمْ یَذْھَبْ اِلٰی اَنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی مَرْئِیٌّ بِالْبَصَرِ فِی الدُّنْیَا اِلَّا شِرْذِمَۃٌ قَلِیْلَۃٌ مِنَ الْمُتَصَوِّفَۃِ لَا یُعْبَأ بِھِمْ (یعنی خدائے تعالیٰ کو جو بے مثل ہے ظاہری آنکھوں سے دیکھنا مشائخ طریقت میں سے کسی کے لئے ممکن نہیں سوائے ان متصوفین کے جن کی بات پایۂ اعتبار سے ساقط ہے) وہ لوگ کہتے ہیں کہ اس راہ کا سالک اس مقام پر جا پہنچتا ہے جہاں بصارت اور بصیرت دونوں ایک ہو جاتی ہیں اور درمیان سے معنیٰ ومطلب کا پردہ ہٹ جاتا ہے۔ اس وقت خواہ یہ کہے کہ میں دل کی آنکھ سے دیکھتا ہوں یا ظاہری آنکھوں سے، دونوں عبارتوں کا ماحصل ایک ہی ہے۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ یہ کیا اشارہ ہے کہ جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ حقیقتِ حال کو وہی لوگ جانتے ہیں جنھوں نے یہ بات کہی ہے یا معلوم کی ہے لیکن اتنا میں جانتا ہوں کہ اس مرتبہ کا وجود بالکل نادر اور نایاب ہے۔ ایک ان میں سے بالکل اہلِ وحدت الوجود کے مذہب کے اعتقاد اور توحید کے معنیٰ کے تخیل اور ان کی بات کے فہم کے مطابق ہے۔ وہ ایک بات کہتا ہے کہ جو ذکر کی وجہ سے قلب کی) صفائی اور باطن کی روشنی کے بقدر اسی کو پہنچی ہے یا حال کے منبع سے ٹپکنے کا دعوای کرتا ہے۔ اس قسم کی باتیں (کرنی) آسان ہیں لیکن جو بات کیفیت کے غلبہ اور سطوتِ سلطانِ وقت کے باعث پیش آتی ہے اس کی تاثیر اور حقیقت کچھ اور ہی ہے۔ اور اس کے باوجود حق وہ ہے جو حقیقت کے کھولنے والوں اور مقامِ تمکین کے رہنے والوں نے قرار دیا ہے جن کی قوتِ مزاجیہ علم وحال اعتدالِ حقیقی تک جا پہنچی ہے اور جو احوال مقامات کے نگہبان و رقیب ہیں۔

حضرت شیخؒ کے ایک مرید کا واقعہ

ہمارے شیخ غوث الثقلین شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ان کے مریدوں میں سے ایک نے اس بات کا دعوای کیا کہ میں خدائے تعالیٰ کو اپنی ظاہری آنکھوں سے دیکھتا ہوں۔ جب یہ بات

حضرت شیخ کی خدمت میں بیان کی گئی تو آپؒ نے اس کو منع فرمایا اور تنبیہ کی یہاں تک کہ اُس شخص نے اس کے بعد وہ بات نہیں دُہرائی اور اس سے متعلق ذرا کوئی بات نہیں کی۔ لوگوں نے (حضرت شیخ قدس سرہٗ سے) عرض کیا کہ زجر اور نصیحت ایک دوسری ہی بات ہے۔ اصل سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اس دعویٰ میں حق پر ہے یا باطل پر؟ آپ نے فرمایا کہ حق مشتبہ ہے، وہ اپنی دریافت اور معلومات کے مطابق صحیح کہتا ہے۔ لیکن اس کو حقیقتِ حال سے اطلاع ہی مشتبہ ہو گئی ہے اور اس نے اس چیز کے راز کو نہیں سمجھا ہے۔ اس نے (واقعی) حقیقت کو اپنی چشمِ بصیرت سے دیکھا ہے اور اس کی بصیرت نے اس کی بصارت کی جانب ایک سوراخ کھول دیا۔ درحقیقت اس کی بصارت کی نظر نے بصیرت پر غلبہ پاکر گمان کیا کہ وہ جو کچھ دیکھ رہا ہے وہ اس کی بصارت کا نتیجہ ہے: مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ (یعنی اللہ تعالیٰ نے) چلائے دو دریا مل کر چلنے والے، ان دونوں میں ایک پردہ ہے تاکہ ایک دوسرے پر زیادتی نہ کرے)۔

یہ کلمہ اُن حضرت (یعنی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ) نے فرمایا ہی تھا کہ حاضرین پر اس سے بیہوشی اور دیوانگی طاری ہو گئی اور وہ صحرا کی جانب نکل گئے۔ (حقیقت یہ ہے کہ) جو بات حقیقت پر مبنی ہوتی ہے اس کی ایسی ہی تاثیر ہوتی ہے۔ اور یہ حکایت جو دعوای کے طور پر پیش کی گئی ہے اس کا یہی حال ہے کہ يَقْرَءُونَ الْقُرْاٰنَ وَلَا يُجَاوِزُ حَنَاجِرَهُمْ (وہ لوگ قرآن مجید پڑھتے ہیں مگر وہ ان کے گلے سے نیچے نہیں اُترتا)۔

وصل ۸

شرع شریف کی اہمیت

ایک مرتبہ پھر بات کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں اپنے مقصود سے دُور جا پڑا ہوں، اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ مقصود سے قریب آگیا ہوں بلکہ عین مقصود میں پہنچ گیا

ہوں۔ اگر اہلِ صنعتِ تصنیف کی اصطلاح میں کلام کی ترتیب ہاتھ سے جاتی رہے تو کہنا چاہیئے کہ اختیار کی باگ دُور انسان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اسی سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ عقل کو ایمان کے بھیدوں اور آخرت کے احوال اور عالمِ اجسام اور عالمِ ملکوت اور اللہ جل شانہٗ اور عظم برہانہ کے اوامر و نواہی کی حقیقت کے جاننے میں شرع شریف کی تعلیم اور آسمانی وحی کے بغیر کوئی راستہ نہیں ہے۔ لہٰذا براہِ راست یہ ہے کہ عقل کو نقل کا تابع بنائیں اور عقل پر کسی طرح کا اعتماد نہ کریں اور کسی طرح کی بحث و تکرار کو کام میں نہ لائیں۔ بندہ بنیں اور انقیاد و تسلیم اختیار کریں ؎

زباں تازہ کردن باقرارِ تو ۔۔۔۔ نہ انگیختن حجت از کارِ تو

(یعنی زبان کو اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کے اقرار سے تازہ کرنا چاہیئے نہ کہ اس کے کاموں میں چون و چرا سے کام لیا جائے)۔

رسول اللہؐ اور صحابہؓ کا اتباع ہی نجات کا ذریعہ ہے

اور اس درستی و راستی سے کہ جو اہلِ سنت و جماعت کے مذہب کی ایک خوبی ہے یہ بات ظاہر ہوتی ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ (یعنی وہ لوگ جو میرے اور میرے اصحاب کے طریقے پر قائم ہیں) وہی نجات پانے والا فرقہ ہے کہ بقول حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم: اِلَّا وَاحِدَۃً مِّنْھُمْ (یعنی تمام فرقوں میں سے وہی ایک فرقہ) مستثنیٰ اور ممتاز ہو گیا ہے۔ اور دین کے تمام ائمہ اور طریقت کے جملہ مشائخ جو مشہور ہیں اور جن کا تذکرہ صفحاتِ روزگار پر لکھا ہوا ہے اسی مذہب میں داخل ہیں اور اسی پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ اور مشائخ کی کتابوں میں جہاں وہ اپنے عقیدہ کا ذکر کرتے ہیں، یہی اعتقاد ہے۔

اہلِ بدعت نورِ ولایت و حقیقت سے محروم ہیں

ارباب بدعت اور اہل ہوا میں سے کوئی ایک بھی مقامِ قرب تک نہیں پہنچا ہے اور نورِ ولایت کے محل تک نہیں پھرا ہے۔

مشائخ کرامؒ نے فرمایا ہے کہ بدعت کی تاریکی کا وجود ہی عملاً اور اعتقاداً ہدایت اور ولایت کی روشنی کے ظہور کا مانع ہے جب تک دل بدعت کی گندگی سے پاک نہ ہوجائے اور سنت کی آرائش کا محل نہ بن جائے اس وقت تک حقیقت کے بھید کا انکشاف نہیں ہوتا اور نورِ یقین دل میں داخل نہیں ہوسکتا ۔

جمالِ شاہدِ قرآں نقاب آنگاہ بکشاید کہ دار الملک ایماں را بیابد خالی از غوغا

(قرآن کا جمال اس وقت بے نقاب ہوتا ہے جب وہ ایمان کے دار الملک کے لئے شور و غوغا سے خالی ہوجائے)۔

وصل ۹

صوفیہ ہی رازِ حقیقت کو صحیح طور پر جانتے ہیں

لوگ یہ گمان نہ کریں کہ تصوف کا طریقہ اہلِ سنت وجماعت کے مذہب کے خلاف ہے اور یہ کہ صوفیہ کا فرقہ اس فرقہ ناجیہ کے علاوہ کوئی اور فرقہ ہے۔ درحقیقت ایسا نہیں ہے بلکہ اس سب سے صحیح ملت کے محققین یہ صوفیہ ہی ہیں کہ جو ظاہر اور باطن دونوں کے انوارِ سنت کو حاصل کرنے والے اور حقیقت کے بھید کو کھولنے والے ہیں۔ سلوک میں طریقت نام ہے عمل اور حال کے اعتبار سے پیروی کرنے اور ظاہر و باطن میں عزیمت اختیار کرنے کا۔ اور صدق و اخلاص کے معنوں کی تحقیق کرنے، نفس کے مکر اور زہد و ورع کی باریکیوں کو سمجھنے اور تہذیب و اخلاق اور باطن کی صفائی کرنے کا کہ کوئی شخص بھی ان سے بہتر طریقے سے نہیں پیش کرسکا۔ اور اعمال و اخلاق، احوال و مقامات، وجد اور ذوق، نکتے اور اشارے اور تمام کمالات میں جو کچھ ان کو میسر ہوا ہے وہ کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہوا۔ چنانچہ شیخ جلال الدین سیوطیؒ[1]

---

[1] حضرت شیخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نویں صدی ہجری کے مؤرخ، محدث اور مفسر ہیں۔ ان کی تصانیف کی تعداد کثیر ہے۔ ان میں تاریخ الخلفاء، اتقان و تفسیر جلالین بہت مشہور ہیں۔ ان کا اہم کارنامہ متقدمین کے علوم کو جمع کرنا ہے۔ ۹۱۱ھ ۱۵۰۵ء میں انتقال فرمایا۔

جو حدیث کے بڑے علمائے متاخرین میں شمار کئے جاتے ہیں اپنے عقائد کے بارے میں خود لکھتے ہیں: وَ نَعْتَقِدُ اَنَّ طَرِیْقَ الْجُنَیْدِ وَ صَحْبِہٖ طَرِیْقٌ مُقَوَّمٌ (یعنی ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ طریقۂ جنیدیہ اوران کے اصحاب کا طریقہ سب سے زیادہ صحیح طریقہ ہے) اور طریقۂ جنیدیہ اوران کے اصحاب کے طریقے کی تخصیص کرنے سے ان کا مقصد اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ طریقۂ جنیدیہ اوران کے اصحاب یعنی ان کے امثال واقران کا طریقہ جامع ہے۔ اس لئے کہ اس میں کتاب وسنت تعظیم وتحکیم اور ظاہر کا باطن پر مقدم ہونا اور شریعت اور حقیقت کے مابین اجتماع سب سے زیادہ مکمل طریقہ پر کیا گیا ہے اور ان کے طریقے میں ظاہری احکام کو ذلیل وحقیر گردانا اور شریعت کے فتوای میں رعایت کا ترک کرنا قطعاً نہیں ہے۔

طریقۂ جنیدیہ کی بنا کتاب وسنت ہے

منقول ہے کہ انھوں (جنید بغدادی[1] قدس سرہ) نے فرمایا ہے کہ: "ہمارے طریقے کی بنا کتاب وسنت پر ہے۔ اور جو کچھ کتاب وسنت کے خلاف اور اس سے باہر ہے، وہ قطعاً مردود اور باطل ہے۔" اور انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "اگر ذکر، نماز اور قرآن کی تلاوت میں ذوق وحضور اور خشیت وخشوع حاصل ہو جائے تو کامیابی کا دروازہ کھلنے کی پوری امید ہے۔ مگر یہ کہ یہ عقیدہ محدود ومسدود ہے" اور انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے "جس کسی نے حدیث شریف نہیں سنی اور جو کوئی فقہا کے ساتھ نہیں بیٹھا۔ اور جس نے ادب سکھانے والے سے ادب نہیں سیکھا، ایسے آدمی کی اگر کوئی پیروی کرتا ہے تو وہ تباہی کے گڑھے میں گرتا ہے۔" قُلْ ھٰذِہٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا

---

[1] سید الطائفہ جنید بغدادی قدس سرہ حضرت سری السقطیؒ کے بھانجے اور خلیفہ تھے۔ بڑے عالم دین اور عارف کامل تھے۔ آپ کا پیشہ آبگینہ فروشی تھا۔ اسی لئے قواریری کہلاتے ہیں۔ فقہ میں حضرت سفیان ثوریؒ کے متبع تھے۔ طریقے میں آپ کے مسلک کی بنیاد صحو پر تھی۔ شریعت کا بے انتہا پاس ولحاظ تھا۔ آپ کا سلسلہ جنیدیہ کہلاتا ہے۔ ۲۷ رجب ۲۹۷ھ/۹۱۰ء کو بغداد میں انتقال فرمایا۔

إِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (الآیہ) (یعنی: کہدے کہ یہ میرا راستہ ہے۔ میں تمہیں اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور پاکیزگی اللہ تعالیٰ کو ہے اور یہ کہ میں مشرکین میں سے نہیں ہوں)۔

مشائخ کے شطحیات و ہفوات

مشائخ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جس حقیقت کو شریعت رد کرتی ہو وہ بے دینی ہے اور اس گروہ میں سے بعض لوگ حال کے غلبے اور محبت میں محویت کی وجہ سے کچھ ایسے کلمات اور اشارات زبان سے نکالتے ہیں جو اہلِ ظاہر کی سمجھ میں نہیں آتے اور ان میں سے بعض ایسے اعمال اور حرکتیں سرزد ہوتی ہیں جو بظاہر شریعت کے فتوے کی مخالفت ہوتی ہیں اور ان کو مشائخ کی شطحیات اور ان کے ہفوات سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ان کو مبہمات اور موہمات بھی کہتے ہیں۔ مثلاً "اَنَا الْحَقُّ" (میں خدا ہوں) یا "سُبْحَانِیْ مَا اَعْظَمَ شَانِیْ" (میری شان کتنی بڑی ہے) یا "لَیْسَ فِیْ جُبَّتِیْ سِوَی اللّٰہُ" (میرے اندر اللہ کے سوا اور کچھ نہیں) یا "اَنَا ھُوَ وَ ھُوَ اَنَا" (میں وہ ہوں اور وہ میں ہے) اور اسی طرح کے اور دوسرے کلمات اور افعال کی مثال ہے جیسے ڈاڑھی سے روشنی کے نکلنے کی (حضرت شبلیؒ کی طرف اشارہ ہے) اور کپڑے کے پیوند۔ اور ان درہموں کی بات کا دل میں آنا جو پانی میں پڑے تھے، اور اس بات کا دل میں پیدا ہونا کہ نفس ہلاکت میں مبتلا ہے۔ اور یہ مثالیں اور ان کلمات اور افعال کے صادر ہونے کا منشا دراصل طغیِ سکر، غلبۂ حال، ضبط اور اختیار کا فقدان ہے۔

صوفیہ کے احوال

ایک دوسری قسم اوضاع، آداب، اصطلاحات اور استحسانات کی ہے جو اس گروہ سے مخصوص ہے، اس کی مثال: رباط کا بنانا، خرقہ کا پہننا، ڈاڑھی کے بال تراشنا، ذکر کی کیفیات کا طاری ہونا، خلوت نشینی اختیار کرنا، سماع کی محفلوں کا منعقد کرنا اور اسی طرح کی اور باتیں ہیں۔ ان امور کے لئے ان لوگوں کے پاس بعض اجتہادات اور استنباطات ہیں جیسے کہ فقہ کے علماء کے پاس ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی علم کے ابواب میں سے ایک ہے کہ جس میں اجتہاد کے صحیح ہونے اور اس کی شرطوں اور سنت و بدعت کی تحقیق کے سلسلہ میں

کلام کیا جا سکتا ہے۔ یہ قسم احوال میں داخل نہیں ہے اور اس میں صوفیہ و فقیہ دونوں برابر ہیں۔ اور یہ دونوں مطالب اصل اور صحت کی بنا پر دلیل ہیں۔ لیکن پہلی قسم غلبۂ احوال کی وجہ سے ہے۔ اور اس گروہ سے جو کچھ حالتِ سکر اور غلبۂ حال میں صادر ہوتا ہے وہ قولاً اور فعلاً محفوظ طریقہ ہے۔ اس طریقہ میں تسلیم و رضا ہے۔ یہ حضرات اپنے مریدوں کو اس بات کی ہدایت نہیں کرتے تھے کہ وہ انکار اور اعتراض کے خیال سے ترک مبادرت کریں۔ یا تقلید کو ناجائز سمجھیں اور ان امور میں متابعت اور اقتدار کے طور پر خود ان کا اتباع کریں۔ بلکہ اس سے باز رکھتے اور منع کرتے تھے۔ احکامِ شریعت اور قواعدِ طریقت میں اتباع و اقتدار ہوتا ہے اس لئے کہ اس کی بنیاد علم پر ہے ذوق اور وجدان کی جزئیات میں نہیں کہ جس کی بنیاد حال پر ہے۔

احوالِ مشائخ کے بارے میں تین گروہ

غلبہ احوال مشائخ اور ان کی شطحیات کے بارے میں بھی تمام لوگوں کے تین گروہ ہیں۔ پہلا گروہ فقہاء محض اور علماءِ ظاہر کا ہے کہ وہ انکار کی راہ پر چلتے ہیں اور اس کو تسلیم نہیں کرتے اور جن کو غلبۂ احوال ہوتا ہے اس کو معذور نہیں سمجھتے۔ پھر ان فقہا کے بھی دو گروہ کر دیئے گئے ہیں۔ ایک گروہ ان لوگوں کا ہے جو واقعہ کے مطابق اور حکم نفس الامر سے قطعاً منکر ہیں ظاہراً اور باطناً اس کو باطل اور فاسد قرار دیتے ہیں۔ اور اس کے واقعہ کاروں کو جہل اور جنون سے نسبت دیتے ہیں۔ اس کا سبب ان (فقہا) کی بے مناسبتی و بے مشربی اور ان کی طبیعت کا جمود نیز ان کے باطن کی خرابی ہے۔ اور اس طرزِ عمل میں اُن کے لئے ڈر ہے کہ وہ برکتوں سے محروم رہ جائیں اور ان کا انجام بُرا ہو۔

فقہا کا دوسرا گروہ ظاہر میں عوام کے لعن طعن کے خیال اور ذرائع کے ختم ہو جانے کے سبب انکار کرتا ہے۔ اور وہ انکار میں پہلے گروہ کا شریک ہے لیکن دل کو زبان کے موافق نہیں رکھ سکتا اور اس لئے باطن میں منکر نہیں ہوتا۔ یہ دونوں گروہ مشائخ کے حق میں تعقیر و تفریط میں مبتلا ہیں۔ جہاں تک ان دونوں کے درمیان فرق کا تعلق

ہے دوسرا گروہ غلو اور افراط میں مبتلا ہے اور اس بات پر اعتقاد رکھتا ہے کہ جو کچھ ان مشائخ نے کہا ہے خواہ ان کا وہ فعل کتنا ہی خلاف شرع ہو وہی حق ہے بلکہ درحقیقت وہی شریعت ہے۔

دوسرے گروہ کے لوگ کہتے ہیں حاشا و کلا کہ ان سے یہ کام شریعت کے خلاف سرزد ہوگیا۔ اس فرقہ کے نزدیک علماء کے اقوال اور فقہ کی روایات کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور وہ اس کو مشائخ کے ساتھ محبت اور پیروں سے عقیدت پر محمول کرتے ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بعض لوگ تکلف اور چرب زبانی اور مصلحتِ وقت کی بنا پر فقہ اور شریعت کی پابندی کا اظہار کرتے ہیں لیکن وقت اور حال دلالت کرتا ہے کہ مضمرِ باطن اور سرِّ مکنون یہی ہے۔

متصوفین اور فقہاءِ متقشفہ

جہلاء اور اس گروہ کو صوفیہ اور فرقہ اول کو فقہا متقشفہ کہتے ہیں، اگرچہ پہلا فرقہ جمود اور کند ذہن ہونے میں بڑھا ہوا ہے لیکن اس دوسرے فرقے کا قدم جہل اور ضلالت میں زیادہ آگے ہے۔ ان میں اتنا ہی فرق ہے کہ پہلا فرقہ بغیر عرفان کے ہے اور دوسرا فرقہ بغیر ایمان کے۔ پہلا فرقہ معرفت کے مقام میں داخل ہی نہیں ہوا ہے اور دوسرا اسلام کے دائرہ سے نکل گیا ہے اس لئے کہ منکر کی سند بظاہر شریعت اور علم کی حکمت ہے اور وہ اس میں معذور ہے۔ اور دونوں گروہ پوری طرح افراط و تفریط میں جا پڑے ہیں۔

راہِ تسلیم اور غلبۂ وجد و حال

بحث کا طریقہ جو اعتدال اور توسط کا مرکز ہے وہ تسلیم ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے" اَسْلِمْ تَسْلَمْ" (یعنی اسلام قبول کرو سلامت رہو گے)۔ دراصل تسلیم کے معنی یہ ہیں کہ لوگ جان لیں کہ ان امور کا منشا صحیح حالت، درست نسبت اور سچی نیت ہے۔ لیکن حال اور وجد کے غلبہ کی وجہ سے ثبات کا قدم اپنی جگہ سے ہٹ جاتا ہے اور ضبط و اختیار کی عنان ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے۔ یہاں تک کہ شریعت کے لحاظ سے اس فعل کی جو برائی ہے وہ نظر سے ساقط ہو جاتی ہے اور صرف معنی اور روحِ عمل پر نظر جم کر رہ جاتی

ہے کہ یہی چیزیں حضوری و اخلاص کا موجب ہیں، اور قدم درمیانی راستے کے سر پر پہنچ کر لڑکھڑا جاتا ہے اور اگر اس حالت کو عالم ظاہر میں مثال کے ذریعہ سمجھنا چاہیں تو یہ حالت غضب کی روانی اور فرحت والی ہے۔ اور وہ درجوں اور مرتبوں کے تفاوت کی بنا پر ہے کہ کس حد تک وہ کسی عقلمند آدمی کو کس طرح حرکت دیتی ہے، بے اختیار کرتی اور بے خود بناتی ہے۔ اگرچہ اختیار کا وہ حصہ جو کسی فعل کا موجب و مبدا ہوتا ہے، باقی رہتا ہے لیکن بات اصل میں خطا ہونے، قائم رہنے، غالب ہونے یا مغلوب ہونے کی ہے۔ وجد اور حال کے غلبہ کو بھی اسی بات پر قیاس کر لیا جائے اور یہ جز سکر و تلوین اور حال کے ابتدا میں نہیں ہوتا۔

ارباب صحو و تمکین

لیکن ارباب صحو و تمکین جو انتہا کے درجے پر پہنچ جاتے ہیں اور جو استقامت اور اعتدالِ حقیقی کے مقام پر متمکن ہو گئے ہیں ان کا ظاہر باطن کے ساتھ برابری کا درجہ رکھتا ہے اور ان کا فرق اور جمع دونوں برابر ہیں۔ ان پر مستیٔ حال کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ اور نہ وہ افراط و تفریط میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ابتدا اور انتہا سے قطع نظر اس گروہ میں سے بعض کو ایسے اطوار اور احوال لاحق ہوتے ہیں جو ان کے مقام ثبات اور اختیار سے باہر کر دیتے ہیں۔ ایک کو عمل کی صفائی اور نفس کی پاکیزگی پر ابھارتے ہیں اور دوسرے کو ذکر کی روشنی اور قلب کی صفائی سے اور ایک دوسرے کو مشاہدہ کی قدرت اور روح کی جلا سے۔ غرض ہر صورت میں یہ حالت صحیح اور نسبت درست ہے۔ لیکن وہ قول اور فعل جو اس کے پُر ہوتے اور غلبہ پانے سے واقع ہوتا ہے صحیح نہیں ہے، نہ یہ مشروع ہے، اور نہ اس سے اقتدا اور اتباع ضروری ہو جاتا ہے۔ اگر کہیں کہ جب قول و فعل نامشروع اور ناقابلِ اقتدا و اتباع ہیں تو وہ ہرگز طاعت اور ہدایت کے باب سے نہیں ہے بلکہ معصیت و ضلالت کے قبیل سے ہوگا: فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ (یعنی: پس حق کے بعد کیا ہے سوائے گمراہی کے) یہ اعتقاد مشائخ رحمہم اللہ کا انکار و تنقیص ہوگا۔ اگرچہ مرتبہ میں فرقۂ اول کے انکار سے کم درجہ

ہی سہی۔

غلبۂ حال قابلِ اعتبار نہیں

اس بات کا جواب یہ ہے کہ کسی حالت کے غلبہ کی صورت میں کسی بات کا صادر ہو جانا اس طریقے پر نہیں ہے جیسا کہ گناہ کرنا یا امر و نہی کی مخالفت کا قصد کرنا۔ اور یہ طبیعت کے میلان، ہوائے نفس اور جہالت کے سبب اور ہوائے نفسانی کی خواہش سے نہیں کہ دلیل ہیں یہ بات اس کے کرنے والے کے تقویٰ، ورع، عزیمت کے حصول، علم و عمل کے اتباع اور کمال و دیانتداری کی بنیاد پر یقین کے ساتھ معلوم ہوگئی ہے۔ بلکہ قہرِ نفس، قطعِ اسباب، غیر دل سے تعلق کا ختم ہو جانا، محبت کا استیلا اور شوق کا غلبہ کلیۃً صدقِ نیت اور قصد کے صحیح ہونے کی بنا پر ہے۔ اور یہ سب کا سب صحیح احوال اور درست مقاصد کا حامل ہے۔ بلکہ کہتے ہیں کہ صاحبِ حال جب اس پر تجلیاتِ حق اور فنا فی اللہ کا غلبہ ہو، غلباتِ حال اور سطواتِ وجد میں مجنون کا حکم رکھتا ہے کہ وہ شریعت کے کاموں کے لئے مکلف نہیں ہے۔ اور اس لئے ان امور کی نسبت صاحبِ حال کے ساتھ معصیت، قباحت اور نامشروع ہونے کی نہ رکھیں۔ ممکن ہے اہلِ باطن کے طریقے میں کہ جو صرف معنوں کے تابع ہیں گنجائش نکل آئے۔ لیکن چونکہ شریعت کا حکم عام ہے اور شریعت کے اصول افراد اور اشخاص کے اختلاف کی وجہ سے بدلا نہیں کرتے۔ نیز کسی کی حالت کی خصوصیت کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتے بلکہ اس میں فعل کے حسن و قبح کا مدار شارع کے امر و نہی پر ہوتا ہے نہ کہ فاعل کے حال کے صدور و اعتبار کی کیفیت پر۔ لہٰذا اس فعل کی ذات اور اس حرکت کی صورت عدمِ مشروعیت کی صفت سے موصوف ہوتی ہے، اور حکم کے دائرہ اور علم کے فتویٰ سے باہر۔ پس حقیقت میں قبح اور انکار فعل کی ذات کی طرف راجع ہوتے ہیں فاعل کی طرف نہیں۔ اور اکثر ایسا بھی ہوا کہ خود فعل کی بنیاد خطا اور معصیت پر ہوئی لیکن فاعل کو خطاوار اور گنہگار نہیں کہا گیا۔ علماء نے کہا ہے کہ حضرت آدم صفی اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا شجرہ کا کھانا معصیت تھا لیکن ان کو عاصی کہنا

بے ادبی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : وَعَصٰی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی (یعنی آدمؑ نے اپنے رب کی نافرمانی کی پس وہ راہِ راست سے بھٹک گیا)۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ "وہ عاصی یا بھٹکے ہوئے تھے"۔ بلکہ جہاں حضرت آدم علیہ السلام نے توبہ کی ہے اس جگہ پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (یعنی، پس اس نے فراموش کردیا اور ہم نے اسے ارادہ میں مضبوط پایا۔) حقیقت میں غلبہ اور حال بھی بھول چوک کا سبب ہوتا اور عزم صمیم کے وجود کو معدوم کر دیتا ہے۔ لہٰذا مشائخ کے ہفوات کے رفع اور انجام کا حکم بھی وہی ہے جو انبیاء صلوات اللہ علیہم اجمعین کی لغزشوں کا، لیکن معصوم ہونا صرف انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے چنانچہ ان کے مبہمات کو قرآن مجید کی متشابہات سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔ واللہ اعلم

وصل ۲۱

مشائخؒ اور انبیاء کی لغزشوں کا فرق

یہ کہنا کہ مشائخ کی لغزش کا وہی حکم ہے جو انبیاء علیہم السلام کی لغزشوں کا محض تشبیہ اور تمثیل کی راہ سے اور ناقص کو کامل کے ساتھ ملانے کے سبب سے تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی شخص کو بھی حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ ان کے احوال اور مقامات میں قرب کے لحاظ سے شریک نہیں کیا جاسکتا۔ حالانکہ اس حکم سے کہ ولایت نبوت کا سایہ ہوتی ہے، جو کچھ اس شخص کی صفات سے ہے وہی بات سایہ میں بھی پیدا ہوجاتی ہے لیکن اس فرع کے ہوتے ہوئے اصل کے ساتھ اس کو کیسے رکھا جاسکتا ہے اور نہ تابع متبوع کے برابر ہوسکتا ہے۔ اولیاء کرامؒ کو جو کمالات حاصل ہوتے ہیں وہ انبیاء علیہم السلام کی پیروی سے ہوتے ہیں چنانچہ مشائخ قدس اللہ اسرارہم نے فرمایا ہے کہ مومنوں کی روحیں اولیاء اللہ کی روحوں سے روشنی حاصل کرتی ہیں۔ اور اولیاء اللہ کی روحیں انبیا علیہم السلام کی روحوں سے، اور انبیاء علیہم السلام کی روحیں حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک سے اور حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس حق سبحانہ وتعالیٰ شانہٗ

ہے۔ حضرت غوث الثقلین[1] قدس سرہ نے فرمایا ہے کہ اولیاء اللہ[رح] کے ساتھ خبر کا تعلق ہے اور انبیاء علیہم السلام کے ساتھ کلام کا۔ انبیاء علیہم السلام پر وحی آتی ہے اور اولیاء کرام[رح] کو الہام ہوتا ہے۔ وحی کلام الٰہی ہے جس کے ساتھ اس کی روح بھی ہوتی ہے اسی کو روح الامین کہتے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے خط پر مہر ثبت کی جاتی ہے اور اس لئے اس کی تصدیق واجب اور اس سے انکار کفر ہے۔ اور الہام اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک خبر ہے کہ اس کا قبول کرنے والا نورِ یقین اور سکینہ (آرام) ہے جو دلی کے پاک قلب میں پیدا کر دی گئی ہیں۔ پس کلام ظاہر اور باطن دونوں میں ہے اور خبر صرف باطن میں ہے۔ چنانچہ کلام کا انکار کفر اور ظاہر و باطن دونوں کی خرابی کا موجب ہے، اور خبر کا انکار صرف باطن کی خرابی کا سبب بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بات سے پناہ دے۔

کوئی ولی نبوت کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا

متکلمین اور محققین صوفیہ کا اس بارے میں اتفاق ہے کہ کوئی بھی ولی انبیاء علیہم السلام کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا اور یہ جو بات مشہور ہے کہ "ولایت نبوت سے افضل ہے" تحقیق کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس بات کا مصدر کون ہے۔ اگر اس سے مراد ولی کی نبی پر فضیلت ہے تو یہ بات قطعاً مردود اور باطل ہے، اور مذہب اہلِ حق کے صریحاً خلاف ہے اور اگر اس کا اشارہ کسی اور طرف اور تاویل کوئی دوسری ہے تو صحیح ہے اور اس سے حق کی مخالفت نہیں ہوتی۔

انبیاء علیہم السلام کی لغزش

ابھی تک ہم انبیاء علیہم السلام کی لغزش کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکے ہیں اور نہ اس کی اس حقیقت تک پہنچے ہیں کہ وہ کیا ہے اور کہاں سے اس کا صدور ہوتا ہے اتنا مفہوم ہوتا ہے کہ "زلت"

---

[1] حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی[رح] جن کو پیرانِ پیر اور ولی الاولیاء بھی کہا جاتا ہے جیلان یا گیلان کے رہنے والے تھے ۴۷۱ھ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم بغداد میں حاصل کی اور وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی اور خلقِ خدا کو فیض پہنچایا۔ آپ کی ذاتِ گرامی اس قدر مشہور ہے کہ مزید کیا بیان ہو۔ آپ کا ۵۶۱ھ/۱۱۶۶ء میں وصال ہوا۔

(لغزش) کے معنی چلتے وقت پاؤں کا پھسل جانا ہے۔ مثلاً کوئی شخص سیدھے راستہ پر چلا جارہا ہے، اس کا مقصد بھی صحیح اور ارادہ بھی درست ہے۔ اتفاق سے کسی قسم کی غفلت یا احتیاط نہ برتنے سے اس کا پاؤں پھسل جاتا ہے اور وہ گر جاتا ہے یا نہیں بھی گرتا بہرحال اس کو اہلِ لغت کے نزدیک زلّت کہا جائے گا۔ اسی سے معنوی لغزش کی کیفیت پر قیاس کیا جاسکتا ہے اور اس کا تصور اور اندازہ ہو سکتا ہے لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام کی اس لغزش اور ان کی احتیاط کے زائل ہونے کا سبب اور اس کی طرف لے جانے والی چیز کیا ہے اور اس کا صدور کہاں سے ہوتا ہے جبکہ ان کے احوال ہماری عقلوں کے قیاس کے مرتبہ سے کہیں بلند ہیں اس کی حقیقت ہماری سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس گروہ کے قواعد کے اعتبار سے جو کچھ بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ شیطان کا حصّہ اور نفس کی تمام صفات اور طبیعت کی تاریکی ان سے یعنی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے دُور اس کی ذات میں معدوم ہے جیسا کہ شق صدر کا واقعہ اس پر دلیل ہے۔ تاہم احکامِ نفس اور جبلت کے جزئیات میں سے کچھ جو لطافت اور نورانیت کی صفت سے متصف ہو گئی ہیں، قائم رکھی گئی ہیں تاکہ اس صفت کے اثر کا ظہور وحی کے نازل ہونے کا سبب اور شریعت کے احکام وضع کرنے کا ذریعہ اور اتباع کرنے کی سمجھ ثابت ہو۔ اِنَّمَا اُنَسّٰی لِاَ سُنَّ (یعنی میں فراموش کیا جاتا ہوں (بھلادیا جاتا ہوں) تاکہ دوسروں کے لئے سنت نہ ہوجائے) جیسا کہ عوارف المعارف میں ہے۔ اور صاحبِ عوارف ہی سے حضرت ابراہیم خلیل الرحمٰن علیہ السلام کا یہ سوال بھی دیا گیا ہے: رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی (اے رب تو مجھے دکھا کہ کس طرح تو مُردوں کو زندہ کرتا ہے) اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کی یہ خواہش کہ رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ (یعنی: اے رب تو میری طرف نظر کر) حال اور انبساط کے غلبہ کی وجہ سے ہے جو وہ بساطِ قرب میں رکھتے ہیں۔ اور کہا کہ اللہ عزوجل کے حضور میں یہ سوال کرنے کی مثال مقامِ قرب میں سوائے غلبۂ حال کے اور کسی وجہ سے نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم انتہی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حوصلہ کی وسعت

مگر سرور انبیا سید اصفیا اور عارفوں کے سردار صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ ہے کہ کوئی غلبہ یا کوئی خود فراموشی آپؐ کی ایسی نہیں جو آپؐ کے استقامت بارگاہ تک راہ نہ پائے۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَ مَا طَغٰی (نہ پھیری آنکھ دوسرے کی طرف اور نہ اللہ کی نافرمانی کی) رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت ہے تو آپؐ ہرگز اس طرح سے سوال نہ کرتے اور اگر کرتے تو مقصود کی طرف اشارہ اسی عبارت میں کرتے کہ جو سراسر تواضع اور ادب ہوتا۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا: اَللّٰھُمَّ اَرِنَا حَقَائِقَ الْاَشْیَاءِ (یعنی اے اللہ مجھے چیزوں کی اس حقیقت سے آگاہ کر دے جو نفس الامر میں ان کی حقیقت ہے)۔ اس سوال کی مضمون بھی اہلِ تحقیق کی نظر میں بعینہٖ وہی ہے جو "اَرِنِیْ" کا ہے اس لئے کہ تمام حقیقتوں کی حقیقت خود اللہ تعالیٰ کا وجود ہے بلکہ اس بات پر اس چیز کا اضافہ اور کیا جائے کہ ماہیت کے کنہہ و حقیقت کا دیکھنا ایک طلب رکھتا ہے۔ اور یہ کہنا کہ اے اللہ مجھے چیزوں کی وہ حقیقت دکھا جو نفس الامر میں ان کی ہے۔ یہ حوصلہ کی وسعت اور استعداد و قابلیت کے کمال کی راہ سے ہے۔ جو مخصوص ہے آپ کے جوہر شریف سے (صلی اللہ علیہ وسلم) اور کسی شخص کو بھی اس معاملہ میں بلکہ اس کے قریب تک حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمسری ممکن نہیں ہے ؎

موسیٰ زہوش رفت بیک پرتوِ صفات   تو عین ذات می نگری در تبسمی

(یعنی: موسیٰ علیہ السلام تو صرف صفاتِ باری تعالیٰ کے ذرا سے عکس سے ہی بیہوش ہو گئے تھے۔ مگر آپؐ عین ذاتِ خداوندی کا مشاہدہ کرتے وقت بھی تبسم کناں رہے)۔

یہ وہ عجیب کلام ہے جو آنحضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں کہا گیا۔ اس سے اعلیٰ اور اچھا کلام کسی نے نہیں کہا۔ اس کے کہنے والے پر اللہ کی رحمت ہو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سوال کی جامعیت و وسعت

ذکر حقائق جمع کے صیغے کے ساتھ جیسا کہ آپ نے فرمایا حقائق الاشیا اور یہ نہیں فرمایا حقیقۃ الاشیاء۔ اس میں ادب کی

رعایت رکھی گئی ہے اور بھید کو پوشیدہ رکھنا مقصود ہے تاکہ بات چھپی ہوئی اور راز پردے میں رہے۔ یا اس سے زیادہ اشارہ ہے کثرت میں وحدت کی طرف، کہ یہ معرفت و شہود کے سب سے مکمل مراتب ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری عنایت دیکھیے کہ جو آپؐ نے اپنے متبعین اور امتیوں کے حق میں کی۔ آپؐ نے "ارنا" فرمایا۔ "ارنی" نہیں کہا کہ غربائے امت کو بھی اس میں سے کچھ نصیب ہو جائے۔ یہاں وہی معنی ظاہر ہوتے ہیں کہ قیامت کے دن دوسرے (انبیاء علیہم السلام) نفسی نفسی کہیں گے اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) وہی اُمتی اُمتی فرمائیں گے۔ سبحان اللہ۔ خلائق کی عقلیں انبیاء علیہم السلام کے کمالات کے بارے میں حیران ہیں اور تمام انبیاء علیہم السلام ہمارے پیغمبر محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ذات میں حیران ہیں۔ دوسرے انبیاء علیہم السلام کے کمالات محدود اور معین ہیں اور یہاں تحدید اور تعین کی سمائی نہیں۔ اور خیال و قیاس کو آپ کے کمال کے سمجھنے کے سلسلہ میں قطعاً کوئی راہ نہیں۔

ایک حدیث کی تشریح

حضرت اصمعی[1] رحمۃ اللہ علیہ علمائے لغت میں سے ایک مشہور عالم ہیں۔ (ان سے) اس حدیث کے معنی لوگوں نے دریافت کیے: اِنَّہٗ لَیُغَانُ عَلٰی قَلْبِیْ وَاِنِّیْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ کُلَّ یَوْمٍ سَبْعِیْنَ مَرَّۃً وَفِیْ رِوَایَۃٍ مِائَۃَ مَرَّۃٍ (یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرے دل پر تیرگی کا کچھ اثر ہوتا ہے تو میں اللہ تعالیٰ سے ستر بار اور ایک روایت میں ہے سو بار مغفرت چاہتا ہوں)۔ لوگوں نے

---

[1] ابو سعید عبد الملک بن قریب اصمعیؒ کی ولادت ۱۲۲ھ / ۷۴۰ء میں بمقام بصرہ ہوئی۔ ان کا حافظہ نہایت قوی تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ کوئی چیز سرسری طور پر دیکھ لیتے یا سن لیتے تو وہ ہمیشہ کے لئے ذہن نشین ہو جاتی تھی۔ ماہر لسانیات تھے۔ قدیم عربی شاعری اور بدوی عربوں کی زبان پر بڑا عبور رکھتا۔ عباسی خلیفہ ابن الرشید کے اتالیق رہے۔ بعد میں مامون الرشید کے دربار سے وابستہ ہو گئے ۲۱۳ھ / ۸۲۸ء میں بصرہ میں انتقال ہوا۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔

دریافت کیا کہ اس غین (تیرگی) کی کیا حقیقت واصلیت ہے اور اس سے کیا مراد ہے؟ انھوں (اصمعیؒ) نے کہا، اِنْ سَاۤلْتَ عَنْ قَلْبِ غَيْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ لَقُلْتُهُ (یعنی: اے سائل اگر تو دوسرے قلب سے متعلق اور سرورِ کائنات وفخرِ موجوداتؐ کے قلب کے علاوہ دوسرے غین (تیرگی) کے متعلق پوچھتا ہے تو اس غین (تیرگی) کے متعلق جو کچھ میں جانتا ہوں وہ بتائے دیتا ہوں۔ لیکن یہاں کہ غین (تیرگی) ہی عین (آنکھ کا پردہ) ہے تو میں اس غین کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔)

حضرت اصمعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ عجز واعتراف اور جہل ونادانی اس کا عین ومعرفت ہے جیساکہ کہا گیا ہے کہ لَا اَدْرِیْ (میں نہیں جانتا) آدھا علم ہے۔ دوسری جگہ اگر اس کو نصف علم سے تعبیر کیا جائے تو یہاں وہ تمام علم متصور ہوگا۔ نصف علم تو وہاں ہوتا ہے کہ جہاں ادراک ممکن ہو اور علم اس حد تک نہیں پہنچتا۔ لیکن جہل کا اعتراف اور طریقۂ انصاف کا سلوک ایک دوسرا ہی علم ہے، مگر یہاں ادراک ممکن اور متوقع نہیں ہے۔ علم سوائے جہل اور نارسائی کے اعتراف کے کچھ نہیں ہوسکتا۔ یہاں علم کا دعویٰ ہی جہل ہے اور علم کا دریافت ہوجانا عین علم ہے۔ اگرچہ علمائے حدیث نے علم کی قدر اور اپنی دانش ومعرفت کے اندازے کے بارے میں کچھ باتیں کہی ہیں، اور قیاس اور اندازہ کے دھاگے میں معنی کے موتی پروئے ہیں لیکن انصاف یہ ہے کہ اس کام کا بھید غیروں کی آنکھوں سے پوشیدہ اور اس حال کی حقیقت عقل کی آنکھ سے نظر نہیں آسکتی۔

اسی حدیث کی دوسری تشریحات

بعضوں نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ غین پردۂ رقیق لطیف ہے کہ بشریت کے حکم میں کثرت کے خلط ملط ہوجانے اور دین اور ملت کے مشکل کاموں کے انجام دینے کے سبب بہت تھوڑے وقفہ کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدۂ شہود پر سستی اور غفلت چھاجاتی تھی۔ اور اسی لمحہ میں اسرار میں مستغرق ہونے کے سبب نورِ وحدت کے ذکر وظہور میں ایک طرح کی کمزوری پیدا ہوجاتی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس حالت کے عارض ہونے اور سستی ظاہر ہونے پر استغفار کیا کرتے تھے کیونکہ حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْنَ (جو باتیں ابرار کے حسنات

ہیں وہ مقربانِ بارگاہِ الٰہی کے لئے سیئات میں داخل سمجھی جائیں گی)۔ اور بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ غین کا یہ پردہ امت کے غم اور ان کی عاقبت کے خوف کی وجہ سے تھا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا استغفار بھی امت کے لئے اور ان کی بخشش ہی کے لئے ہے۔ اس بات کے کہنے والے پر اللہ کی رحمت ہو۔ بعض صوفیہ نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ انوار کی غین ہے اغیار کی غین نہیں۔ اس پردہ میں جو چیز آدمی کو نظر آتی ہے اگر وہ تمام عارفوں پر مکشوف ہو جائے تو ان میں اس کے برداشت کی طاقت نہ رہے اور وہ طرح طرح کی مستی کرنے لگیں۔ اور وہ یہ شور مچانا شروع کر دیں کہ میں حقیقت کو بے پردہ دیکھ رہا ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ سے کتنا تقرب تھا

ایک روز حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں میرے درجاتِ تقرب بے انتہا بڑھے ہوئے ہیں کہ اس سے زیادہ ہرگز کسی دوسرے کے نہیں ہو سکتے اور وہ یہ ہے کہ میرے اور پروردگار کے درمیان نور کے ستّر ہزار پردے حائل ہیں۔ پس جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر لمحہ اور ہر آن نورِ جلال میں سے ایک پردہ مشہود رہتا تھا، اور اس سے اوپر کے نور کی تجلی سے وہ پردہ الگ ہو جاتا تھا اور مقامِ اوّل میں توقف سے مقامِ ثانی کے انکشاف کے بعد آپ استغفار کرتے تھے۔ یہ چیز درجاتِ قرب اور مشاہدۂ تجلیات میں عین ترقی ہے۔ اور یہ حالت اس زندگی تک ہی نہیں ہے بلکہ ابدالآباد تک یہ حال اسی طریقہ پر رہے گا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات کی کوئی حد نہیں ہے۔ پس یہاں عین عین مشاہدہ ہے اور پردہ نشین (پردہ میں بیٹھنا) پردہ برداشتن (پردہ اٹھانا) کے معنوں میں آتا ہے۔ معلوم ہونا چاہیئے کہ اِنَّ لِلّٰہِ سَبْعِیْنَ اَلْفَ حِجَابٍ مِّنْ نُوْرٍ (یعنی: تحقیق کہ اللہ تعالیٰ کے لئے نور کے ستّر ہزار پردے ہیں)۔ (اسی کے متعلق) ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ اس سے مراد کثرت اور تعبیر و تاویل ہے، حصر اور تحدید نہیں۔ مگر یہ کہ اس مقامِ قرب سے جبرئیل علیہ السلام نہ گذر سکے اور اس حکم کے بموجب کہ ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کا مقام متعین نہ ہو۔

اس نے اس حد سے آگے ترقی اور تجاوز نہیں کیا ؎

اگر یک سر موئے برتر پرم فروغ تجلی بسوزد پرم

(یعنی: اگر میں بال برابر بھی آگے کی طرف پرواز کروں (یعنی آگے کی طرف بڑھوں) تو تجلی الٰہی کی زیادتی سے میرے پر جل جائیں)۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہمیشہ ترقی پر ترقی ہے اور حق کی تجلیات کے رنگ میں آپؐ کے مشاہدات کی ازل سے ابد تک کوئی انتہا نہیں ہے۔

شارحینِ حدیث کی توجیہات

بعض شارحینِ حدیث نے اس غین کی کیفیت کے بیان میں دو وجہیں بتائی ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اس غین کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چشمِ بصیرت پر پیدا ہو جانا آنکھ پر پلک کے انطباق کے مانند ہے۔ جس طرح کہ آنکھوں پر پلکوں کا جمع ہو جانا اگرچہ ظاہر میں نقصان کی صورت پیدا کرتا ہے اور دیکھنے سے مانع ہوتا ہے کہ باصرہ کا کمال یہی ہے کہ دیکھے۔ لیکن وہ آنکھ کی سیاہی کی تکمیل و تفصیل کا موجب اور گرد و غبار اور دھوئیں اور ان سب چیزوں سے جو اس کو ضرر پہنچائیں اس کا محافظ بھی ہے۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کی آنکھ غیر انفاس کے دھوئیں کے ذرات اور کثرت و آثار کے غبار کے ہیجان سے کدورت نہیں پاتی اور آپ کی بصیرت کا آئینہ زنگ آلود نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس غین کا وارد ہونا اور اس پردہ کا ہٹنا اس غبار اور کدورت سے اس کی نگہداشت کرنے کا موجب اور اس کی حفاظت اور صفائی کا سبب ہے۔ پس اگرچہ وہم کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ نقصان کی شکل اختیار کر لیتا ہے لیکن حقیقت میں کمال کے تکملہ و تتمہ کے ساتھ مل کر خود کمال بن جاتا ہے اور اس کے باوجود بھی آپ استغفار فرماتے اور کمالِ محبت اور دیدار کے شوق میں معذرت خواہ ہوتے تھے تاکہ چشم زدن کے لئے بھی جمالِ محبوب نظر سے نہ ہٹے ؎

یک چشم زدن غافل ازاں ماہ نباشم شاید کہ نگاہے کند آگاہ باشم

(یعنی: ایک پلک جھپکنے کے وقفہ کے لئے بھی میں اس (محبوب) چاند سے غافل نہیں رہتا شاید کہ کہیں محبوب میری طرف دیکھے اور مجھے پتہ بھی نہ چلے)۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح اقدس ہمیشہ ترقی کے مقام پر اور رفیقِ اعلیٰ تک پہنچنے کے شوق میں اور ملکوت سے کہ ان کی اصل خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک ہے ملنے کے اشتیاق میں رہتی تھی۔ اور چونکہ قلب روح کا تابع ہے اور نفس، قلب کا تابع ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ روح کی حرکت اور قلب کا اٹھان زیادہ تیز اور مکمل ہیں نفس کی حرکت سے، پس ناچار نفس اوپر اٹھنے اور مقامِ قرب اور حریم عزت میں داخل ہونے کے وقت روح اور قلب کی مصاحبت اور رفاقت سے جدا ہوجاتا اور تعلق کے ٹوٹنے کا موجب ہوتا تھا کہ وہ ہئیت عنصری کی بقا کا سبب ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور اس کی غیر محدود رحمت اور مہربانی جو خلق کی تکمیل اور ہدایت کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عنصر شریف کی بقا کی متقاضی ہوتی تھی اس غین کے ورود اور اس پردے کے ہٹنے کو آپؐ کے قلب شریف کی حرکت میں دیر کر دیتی تھی تاکہ وہ کلیتہً روح کی جانب نہ چلا جائے اور عالمِ قدس کے ساتھ ملحق نہ ہوجائے۔ اور دنیا کا علاقہ ٹوٹ نہ جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کمال شوق اور اس عالم کے جذب وکشش کے سبب اور قلب کی حرکت کے سست پڑجانے کی وجہ سے اس حکمت اور مصلحت کو سمجھنے اور قبول کرنے کے باوجود امت کی تکمیل اور ہدایت کی حرص میں استغفار فرماتے اور معذرت خواہ ہوتے۔

یہ دو وجوہ شیخ الوقت شہاب الدین[1] سہروردی قدس سرہ کے افادات اور کلمات میں سے ہیں اور طیبی نے اس کو شرح مشکوٰۃ میں نقل کیا ہے۔

---

[1] ابوحفص عمر بن محمد بن عبداللہ البکری معروف بہ شیخ شہاب الدین سہروردی سلسلۂ سہروردیہ کے سرخیل ہیں ۵۳۹ھ/۱۱۴۴ء میں بغداد میں پیدا ہوئے اور ۶۳۲ھ/۱۲۳۴ء میں وہیں وصال ہوا۔ فقہ اور دیگر علوم میں متبحر تھے۔ علم باطنی اپنے چچا شیخ ابوالنجیب سہروردی سے حاصل کیا۔ نہایت متقی اور متبع سنت تھے۔ آپ کی تصنیف عوارف المعارف تصوف کی امہات الکتب میں شمار کی جاتی ہے۔

اصمعیؒ کی تشریح سب سے زیادہ مناسب ہے

اگرچہ پہلی وجہ کی نزاکت اور دوسری وجہ کی نفاست سے انکار نہیں کیا جا سکتا اس کے باوجود مجھے حضرت اصمعیؒ کی بات سب سے زیادہ بھلی لگی ہے۔ اور قلبِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتِ شان اور اس کے ادب سے کہ جس کی حقیقت کو سوائے خدائے تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے۔ ہر شخص جو کچھ بھی کہتا ہے اپنی معرفت اور قیاس کے اندازہ اور حد کے مطابق کہتا ہے چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام سب سے بلند ہے لہٰذا جو کوئی آپؐ کے مقام کے بارے میں کچھ بات بتاتا ہے اور آپ کی اس حقیقتِ حال کو جو خدا کے ساتھ ہے کھولتا ہے۔ گویا وہ متشابہات کی تاویل کرتا ہے۔ بیچارہ اصمعیؒ باوجود اس کے کہ لفظ میں گرفتار ہے عجیب و غریب مفہوم و معانی کی طرف گیا ہے۔ لیکن

صحبتِ نبویؐ اور زمانِ نبوت کا اثر

یہ فہم اس کو لغتِ عرب کی جو خود سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی لغت ہے پیروی کی برکت سے حاصل ہوئی تھی اور اس زمین کی آب و ہوا نے تاثیر کی تھی۔ اس نور کی اصل و حقیقت زمانِ نبوتؐ کے قرب کی تاثیر ہے چنانچہ امام علی حکیم ترمذیؒ[1] کا کہنا ہے کہ "میں جوانی میں جو کچھ انوار و آثار پاتا تھا وہ بڑھاپے کے وقت علم و عمل اور معاہدہ کی زیادتی کے باوجود نہ پا سکا۔ اور اس کی وجہ کے سمجھنے میں حیران و پریشان تھا۔ آخر میری سمجھ میں آیا کہ جوانی کی حالت کا کمال حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے قربت کی وجہ سے تھا۔ جب زمانہ کے قرب

---

[1] شیخ محمد بن علی حکیم ترمذیؒ طریقہ حکیمیہ کے سرخیل ہیں آپ کی کنیت ابو عبداللہؒ ہے۔ متقدمین اکابر مشائخ میں آپ کا شمار ہے۔ امام اعظم حضرت نعمان بن ثابت ابو حنیفہؒ کے احباب میں تھے۔ سفینۃ الاولیا میں آپ کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمانِ رسالتؐ سے جتنا زیادہ بعد ہوتا جاتا ہے اتنا ہی علم و عمل میں ضعف ہوتا جاتا ہے۔ آپ کی وفات ۲۵۵ھ ۸۶۹ء میں ہوئی۔

کی یہ خاصیت ہے تو عین اس زمانہ کا کیا اثر ہوگا۔ (کیونکہ اس وقت) اس حقیقت کے جمال سے پردہ ہٹا ہوا تھا اور آفتاب یقین سمت الراس پر پہنچا ہوا تھا اسی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحابؓ کی فضیلت ہر اس شخص پر لازم آتی ہے جو ان کے بعد آیا۔ اور اسی لئے قوت القلوب میں تحریر ہے کہ ایک نظر میں جو جمالِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑتی تھی اور ایک ساعت کی نشست میں جو آپؐ کے حضور میں ہوتی تھی وہ بات ظاہر ہوتی اور کام بنتے تھے کہ دوسرا اس کو بہت سی تنہائیوں میں رہ کر اور متعدد چلّے کھینچ کر بھی نہیں ظاہر کر سکتا یا بتا سکتا۔ اور باوجود ان چند آیتوں اور حدیثوں کے جو امت کے ان غرباء اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان خاص متبعین کی فضیلت کے بارے میں آئی ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے بعد ہوں گے۔ ان کے بارے میں گمان یہ ہے کہ مقصود یہی لوگ ہیں۔

حضورؐ کا فیض اولیاء کے لئے خاص اور تمام امّت کے لئے عام ہے

اولیائے امت کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معنوی صحبت دائمی ہے، اور حصولِ انوار اور فیض آثار مستقل اور باقی رہنے والے ہیں۔ آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب توجہ کرنے والے تمام لوگوں کو اور اس کوچہ کے بھکاریوں کو اس نور میں سے حصہ ملے گا بلکہ تمام موجودات اور کل مخلوقات کو آپؐ کے وجود اور رحمتِ عام کے انوار نصیب ہیں۔ وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ ۝ (اور ہم نے تجھ کو تمام عالموں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے) اور اگر وہ لوگ رحمت کی قدر نہ سمجھیں اور کفرانِ نعمت کرتے رہیں تو اس کا کسی کے پاس کیا علاج ہو سکتا ہے ؎

شکرِ فیضِ تو چمن چوں کند اے ابرِ بہار — کہ اگر خار و اگر گل ہمہ پروردۂ تست

(یعنی: اے ابرِ بہار! چمن تیرے فیض و کرم کا اس لئے شکر گذار ہے کہ اس کے کانٹے اور پھول سب تیرے ہی پالے ہوئے ہیں)۔

ناامید نہیں ہونا چاہیے کیونکہ حقیقتِ محمدیؐ کے بھی اسی طرح ادوار ہیں جس

طرح آسمان کے دورے ہیں۔ جب تک دورہ ہوا نسبت کس کے ساتھ قائم کی جلئے۔ اور ایک ستارہ کی نظر آپ کے صفات اور کمالات کے کواکب میں سے کس پر پڑے اور کس کے چہرے پر چمکے۔ جب تک کہ آپ کے حال کی پیشانی سے کمال کا نور ظاہر ہو اور عزتِ اسلام کے معنی آپ کی ذات میں پیدا ہوں۔ غالباً یہ دورہ ایک سو سال میں ہوتا ہے

ہر صدی میں ایک مجدد پیدا ہوتا ہے

يُبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰى رَاْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ يُّجَدِّدُ اَمْرَ دِيْنِهَا۔ (اس امتِ محمدیہ کے لئے ہر سو سال میں کوئی ایک شخص ایسا پیدا کیا جاتا ہے جو اس امت کو دین پر چلنے کا حکم دیتا ہے)۔ اب یہ گیارہویں صدی ہجری ہے دیکھئے اس دولت کا سکہ کس کے نام رہتا ہے۔ وہ ایسا آدمی ہونا چاہیئے کہ حقیقت کا اجارہ اس کے ہاتھ پر ہوتا کہ اس زمانے کے عام انسانوں کو کہ جو حقیقت کو لہو ولعب سمجھنے لگے ہیں اور جنھوں نے اپنی جہد وسعی میں ہزل کی آمیزش کرلی ہے اعجاز اور قوت کے زور سے ایسا متاثر کیا جائے کہ ان کو دم مارنا ممکن نہ رہے: حَتّٰى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّا اِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا (یعنی: یہاں تک کہ تنگ ہو جائے ان پر زمین باوجود اپنی وسعت اور کشادگی کے اور تنگ ہو جائے ان پر خود ان کی ذات اور وہ جان جائیں کہ کوئی پناہ کی جگہ نہیں ہے سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے۔ پھر وہ ان کی طرف متوجہ ہو)۔

روئے زمیں ز تیرگی منکرانِ عشق ۔۔۔ محتاج شست وشوی دگر شد کجاست نوح

(یعنی منکرانِ عشق کی تیرگی سے تمام روئے زمین دوبارہ شست وشو کی محتاج ہو گئی ہے اب نوح علیہ السلام کہاں ہیں جن کی دعا سے طوفان آئے اور سطح زمین سے اس تیرگی کو دھو ڈالے)۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔

وصل ۱۱۰

مشائخ کی لغزش حال اور سکر کے غلبہ کے سبب ہے

پھر میں کہاں گرا اور کہاں سر اٹھایا (یعنی

میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا) بات یہاں سے چلی تھی کہ مشائخ کی لغزش کی وجہ حال اور سکر کا غلبہ ہے، اور وہ حال صحیح اور نسبت درست ہے۔ لیکن وہ قول وفعل جو حال کے غلبہ سے نمودار اور صادر ہو، اقتدار کا محل اور اتباع کے قابل نہیں ہے۔ مشائخ اس کے صدور میں معذور ہیں، اور ایسے ہی ہیں کہ گویا کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ کچھ مثالیں اقوال وافعال سے بطورِ کلیہ اور اجمال ذکر کردی گئی ہیں۔ اب اگر ان میں سے بعض جزئیات تفصیل سے ذکر کریں تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اقوال میں تعرض (اعتراض) کرنے کے لئے وقت میں گنجائش نہیں اس لئے کہ وہ فنا اور توحید کے اشاروں کے باب میں ہے۔ لہٰذا اس میں قیل وقال مناسب نہیں ہے۔ افعال کی جنس سے کچھ حکایتیں مذکور کی جاتی ہیں شاید اس سے مقصد حاصل ہو جائے۔

شیخ شبلیؒ کا ایک واقعہ

مثلاً کہا جاتا ہے کہ حضرت شبلی[1] قدس سرہ کا بیٹا فوت ہو گیا (جس کے صدمہ کی تاب نہ لاکر) لڑکے کی ماں نے کمزوری کا اظہار کیا اور بہت رونا اور چلّانا شروع کیا اور اپنے سر کے بال نوچ ڈالے اور شیخ شبلیؒ نے بھی اپنی ڈاڑھی مونڈ ڈالی اور بیٹھ گئے۔ اہلِ بغداد ان کی خدمت میں (تعزیت کے لئے) آئے لیکن ان کی اس حرکت (ڈاڑھی مونڈی ہوئی) سے بہت بیزار ہوئے اور کسی شخص نے بھی ان کے بیٹے کی تعزیت ان سے نہ کی۔ آخر شیخ شبلیؒ کے دوستوں میں سے ایک نے دریافت کر ہی لیا کہ "آخر یہ کیا حرکت تھی جو تم نے کی، اور یہ کہ ایسی حرکت کس لئے کی؟" انھوں نے جواب دیا "اپنی گھر والی کی موافقت میں۔" لوگوں نے کہا۔ "حقیقتِ حال بیان کیجئے، اس جواب سے ہماری تسلی نہیں ہوئی۔ اہل و عیال کی تقلید میں تو ایسی حرکت نہیں کرنی چاہیے۔" شبلیؒ نے کہا "اگر تم لوگ صحیح بات

---

[1] آپ کا نام جعفر اور کنیت ابوبکر تھی۔ خراسان کے قصبہ شبلہ کے رہنے والے تھے اس لئے شبلی کے نام سے مشہور ہوئے۔ مالکی فقہ کے تبع اور حضرت جنید بغدادی سے مرید تھے۔ سکر کا غلبہ تھا اور ہمیشہ ذکر اسم ذات (اللہ۔ اللہ) کیا کرتے تھے۔ ۲۴۶ھ / ۸۶۰ء میں ولادت اور ۲۷ ذی الحجہ ۳۳۴ھ / ۹۴۶ء میں انتقال ہوا۔ مزار بغداد میں ہے۔

پوچھتے ہو تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ مجھے یہ بات معلوم ہے کہ جو کوئی دوسرے کو حق بات کرنے کی ہدایت کرتا ہے اور خود غافل رہتا ہے وہ لعنت کا سزاوار اور خدائے تعالیٰ سے دوری کا مستحق ہو جاتا ہے اور رحمتِ حق کی نظر سے گر جاتا ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ لوگ میرے پاس تعزیت کے لئے آئیں، دستور اور عادت کے مطابق باتیں بنا کر اِنَّا لِلّٰہِ کہیں اور نصیحت کریں۔ لیکن ان کے دل حق تعالیٰ سے غافل اور محجوب ہو جائیں اور اس طرح وہ لعنت ملامت کے مستحق ہوں۔ اور میں اس سب معاملہ کا سبب بنوں۔ پس میں نے اپنی ڈاڑھی قربان کی اور اس طرح خلقِ خدا کو ہلاکت اور نقصان کے بھنور سے بچا لیا۔"

اب دیکھئے کہ اس میں کیسی سچی نیت اور گہری نظر ہے، ان کے دل میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کی کس قدر تعظیم اور حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی کتنی عظمت ہے اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر ان کی کس قدر شفقت و رحمت ہے۔ اور یہ سب کچھ سینہ کے احوال اور بلند مقامات کا کرشمہ ہے۔ لیکن اس فعل کا صدور کہ اس نیت سے ڈاڑھی مونڈی جائے شریعت میں جائز نہیں ہو گی اور کسی ذی فہم سے اس قسم کا کام سرزد نہیں ہوتا۔ دیکھئے کہ علم و عمل، تقویٰ اور ریاضت کی رو سے ان کا درجہ کتنا بلند ہے اور اس نیت اور غلبہ اور اس حال کے باوجود اُن سے یہ فعل صادر ہوا تو کتنی شدت کے ساتھ غلبہ و بے اختیاری اور مستی نے زور مارا ہو گا۔ مگر اصل میں قاعدہ یہ ہے کہ نیت مباحات اور مستحبات میں چلتی ہے نہ کہ حرام اور مکروہ باتوں میں۔ یہ مقام وہ ہے جہاں ان کی اس حالت و کیفیت پر مجنونوں کا حکم لگایا جائے گا۔ واللہ اعلم

شبلیؒ کے سکر کی کیفیت

شیخ شبلی قدس سرہٗ اہلِ وجد کے امام اور اربابِ سکر و حال کے سرخیل تھے۔ ان کے برابر کسی دوسرے کو قیاس میں بھی نہیں لا سکتے۔ حال کے غلبہ میں اپنے آپے سے اس حد تک بے خبر اور مستغرق و غائب ہو جاتے تھے کہ کہا جاتا ہے کہ بھوؤں اور پلکوں کے بالوں تک کو نوچ ڈالتے تھے۔ بعض اوقات اپنے گوشت اور اپنی کھال تک کو زنبور سے پکڑ لیتے تاکہ محض تکلیف کی بنا پر کچھ دیر کے لئے ہوش میں آ جائیں اور ان کو اس بیہوشی اور سکر سے نجات مل جائے۔ ان کے

زمانے کے لوگ ان کو دیوانہ کہتے اور مجنوں سمجھتے تھے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے دَور کے عقلاء میں سے تھے کیونکہ اَکیَسُ النَّاسِ اَزۡھَدُھُمۡ فِی الدُّنۡیَا (یعنی: سب سے زیادہ عقلمند وہ شخص ہے جو کہ دنیا کی طرف سے سب سے زیادہ بے رغبت ہو)۔ سچی بات یہ ہے کہ اس دیوانگی پر لاکھوں عقلیں قربان ؎

دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی — دیوانۂ تو ہر دو جہاں راچہ کند

(یعنی: تو نے دیوانہ کر کے دونوں جہان بخش دیئے (لیکن) تیرے دیوانے کو دونوں جہاں سے لینا ہی کیا ہے)۔

شبلیؒ کی تعظیم کا ایک واقعہ

روایت ہے کہ ایک روز وہ (شبلی قدس سرہ) حضرت ابو بکر مجاہدؒ[1] رحمۃ اللہ علیہ کے پاس (جو اپنے دَور کے بڑے عالموں میں تھے) گئے۔ ابو بکر مجاہدؒ کی نظر جیسے ہی اُن پر پڑی کھڑے ہو گئے اور اُن (شبلیؒ) کی پیشانی کو بوسہ دیا اور پوری تعظیم کے ساتھ اپنے پہلو میں بٹھایا۔ فقہا کی وہ جماعت جو ابوبکرؒ کے پاس موجود تھی کہنے لگی "تم شبلیؒ کے ساتھ ایسا عمل کرتے ہو، حالانکہ تم خود اور تمام بغداد والے ان کو مجنوں سمجھتے ہیں۔" ابو بکرؒ نے کہا "یہ فعل میں نے ہی نہیں کیا بلکہ جیسا کچھ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے دیکھا ویسا ہی کیا ہے۔ چنانچہ آج رات میں نے خواب میں دیکھا کہ شبلیؒ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں حاضر ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور ان کی پیشانی کو بوسہ دیا اور اپنے پہلو میں بٹھایا۔ میں نے دریافت کیا 'یا رسول اللہ یہ باتیں جو آپ شبلیؒ کے ساتھ کرتے ہیں، وہ کس بنا پر اس اکرام اور تعظیم کے مستحق ہیں؟' آپؐ نے فرمایا: 'وہ ہر نماز کے بعد یہ آیت پڑھتا ہے لَقَدۡ جَآءَکُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ عَزِیۡزٌ عَلَیۡهِ مَا عَنِتُّمۡ حَرِیۡصٌ عَلَیۡکُمۡ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ۝ (یعنی: تحقیق کہ

---

[1] احمد بن موسیٰ بن العباس التمیمی البغدادی، المعروف بہ ابو بکر بن مجاہدؒ۔ آپ کا شمار اس زمانہ کے مشہور قراء میں ہوتا تھا۔ خلق و ادب میں بے مثل اور جود و سخا میں لاثانی تھے۔ ولادت ۲۴۵ھ/۸۵۹ء اور انتقال ۳۲۴ھ/۹۳۶ء میں بغداد میں ہوا۔ متعدد کتابوں کے مصنف تھے جن میں القراءۃ الکبیر، کتاب القرائت، القراءۃ السبعۃ، قراءۃ علیؓ بن ابی طالب وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔

تمھارے پاس تمھارے ہی قبیلہ اور گروہ میں سے ایک رسول آیا جس پر تمھاری ہر تکلیف گراں گذرتی ہے وہ تمھاری ہدایت پر حریص ہے اور مومنین سے محبت کرنے والا ہے اور ان پر مہربان ہے)۔ اور اس کے بعد درود بھیجتا ہے۔

شبلیؒ کا ایک اور واقعہ

شیخ شبلی قدس سرہ ہی سے (منقول) ایک یہ بھی روایت ہے کہ ایک دن ان کے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ "تو بخیل ہے۔" (اس لئے) انھوں نے عہد کیا کہ جو کچھ آج فتوح سے حاصل ہوگا اسے اُس پہلے فقیر کو دیدوں گا جو سامنے آئے گا۔ (چنانچہ اس دن) پچاس دینار اُن کو ملے، انھوں نے وہ دینار لئے اور باہر آئے۔ گذرگاہ پر اُن کو ایک ایسا فقیر ملا جس کی بینائی جاتی رہی تھی اور وہ ایک حجام کے پاس بیٹھا ہوا سر منڈوا رہا تھا۔ شبلیؒ نے (دیناروں کی) وہ تھیلی اس کو دی تو اس نے کہا "مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، اس حجام کو دیدو جو خدمت کرتا ہے۔" شبلیؒ نے کہا "اس تھیلی میں دینار ہیں۔" اس نے شبلیؒ کی طرف منھ کر کے کہا "ہم نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم بخیل ہو۔" پس شبلیؒ نے دینار اس حجام کے سامنے رکھ دیئے۔ حجام کہنے لگا "ہمارا یہ عہد ہے کہ فقیروں کی خدمت اجرت لے کر نہیں کریں گے۔" پس شبلیؒ نے وہ تھیلی اٹھائی اور لے جاکر دریائے دجلہ میں ڈال دی اور کہا "جس شخص نے تجھے عزت دی اللہ تعالیٰ نے اسے ذلیل کیا۔"

اس موقع پر علمائے ظاہر کہتے ہیں کہ "انھوں نے اسراف کیا کہ تھیلی کو دریا میں ڈال دیا۔" لیکن یہاں یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ انھوں نے جو کچھ کیا اس کی تحریک کہاں سے ہوئی تھی۔ واللہ اعلم

شبلیؒ کا ایک تیسرا واقعہ

ایک مرتبہ شبلی قدس سرہٗ نئے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ لوگوں نے ان کے کپڑے کا دامن چاک کر کے کہا کہ "علم اس بات کا حکم دیتا ہے کہ نئے کپڑے کے ٹکڑے کر دیئے جائیں اور اس کو ضائع کر دیا جائے۔" شبلیؒ نے کہا "علم اس بات کا حکم دیتا ہے کہ گھوڑوں کے ٹخنے کی رگیں کاٹ دو اور ان کو ذبح کردو۔" (اس بات میں) حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کے فقعہ کی طرف

اشارہ تھا کہ انھوں نے گھوڑوں کی پیشانی کے بال پکڑ رکھے تھے اتنے میں سورج غروب ہونے کے قریب ہوا اور عصر کی نماز کا وقت گذر گیا۔ پس اس جرم کی مکافات میں اور توبہ کے ارادہ سے انھوں نے گھوڑوں کے ٹخنہ کی رگیں کاٹیں اور ان کی گردن ماری چنانچہ قرآن شریف میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا: فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ (یعنی، پس شروع کیا ہاتھ پہنچانا اس کی پنڈلی تک اور گردن تک) یعنی خدائے تعالیٰ کے ذکر کی غیرت کے سبب اس کو ذبح کر دیا اور اس کی پنڈلی کاٹ دی۔ بعض لوگوں نے مسح سوق اور اعناق کو ظاہر پر محمول کیا ہے یعنی گھوڑوں کی پنڈلی اور گردن پر ہاتھ پھیرا اور ان کو آزاد کر دیا۔

ارباب احوال کے نزدیک ان حکایات کی حیثیت

اکثر ارباب احوال نے ان حکایتوں کو جو مثال کے طور پر نقل کیا ہے اس کا مقصد، نفس کی ریاضت، اس پر سختی برتنے، مشقت میں ڈالنے اور مقام توحید و توکل کی تحقیق اور وسائط و اسباب سے قطع نظر کرنے کے لئے ہے۔

ابوحمزہ خراسانی رح کا واقعہ

امام عبداللہ یافعی[1] رحمۃ اللہ علیہ، ابوحمزہ[2] خراسانی قدس سرہ کے محاسن بیان کرتے ہوئے نقل کرتے ہیں کہ "انھوں نے کہا کہ میں حج کے لئے گیا۔ راستہ میں (ایک کنواں) تھا (میں اپنی دھن میں چلا جا رہا تھا)

---

[1] امام عبداللہ یافعی رحمۃ اللہ علیہ یمن کے رہنے والے تھے۔ کنیت ابوالسعادات اور لقب عفیف الدین تھا۔ شافعی فقہ کے پیرو اور صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ علوم ظاہری اور باطنی میں ایک امتیازی درجہ رکھتے تھے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح سے بے حد عقیدت تھی۔ آپ کی متعدد تصانیف ہیں جن میں تاریخ یافعی تکملہ روضۃ الریاضین اور نشر المحاسن مشہور ہیں۔ ان کتابوں میں آپ نے خصوصیت سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کے حالات اور خوارق عادت کا ذکر کیا ہے۔ آپ کی وفات ۲۰ر جمادی الاول ۷۶۰ھ، ۲۲ر اپریل ۱۳۵۹ء یکشنبہ کے دن ہوئی۔ مکہ معظمہ میں حضرت فضیل بن عیاض رح کے مزار کے متصل جنت المعلیٰ میں دفن ہوئے۔

[2] حضرت شیخ ابوحمزہ خراسانی قدس سرہ نیشاپور کے رہنے والے اور مشائخ کبار میں سے تھے۔ حضرت جنید رح بغدادی کے معاصر اور حضرت شیخ ابوسعید خراز رح کے صحبت یافتہ تھے۔ آپ کا توکل بہت بڑھا ہوا تھا چنانچہ

کہ یکایک اس کنوئیں میں گر پڑا۔ اب میرے نفس میں اور مجھ میں جنگ شروع ہوگئی (نفس کا کہنا تھا) کہ "فریاد کرتا کہ کوئی سُنے اور تجھے کنوئیں سے باہر نکالے۔" میں نے کہا "خدا کی قسم میں ہرگز فریاد نہیں کروں گا اور سوائے خدائے تعالیٰ کے اور کسی سے مدد نہیں چاہوں گا اور جب تک حق تعالیٰ اپنی قدرت سے پردۂ غیب سے غیر فطری اسباب نہیں پیدا کرے گا باہر نہیں نکلوں گا۔" (ابھی میں اپنے نفس سے انہی باتوں میں مشغول تھا) کہ یکایک دو آدمی کنوئیں کی منڈیر پر آئے اور آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ "یہ کنواں بالکل سرِ راہ واقع ہے ہم اس کو بالکل پاٹ دیں تاکہ اس میں کوئی گرے نہیں۔" چنانچہ انھوں نے کنوئیں کے منھ کو بند کر دیا اور اس کا نشان ہی مٹا ڈالا۔ اس دوران میں کہ وہ کنوئیں کا منھ بند کر رہے تھے میرا ارادہ ہوا کہ شور کروں اور ان کنوئیں کے بند کرنے والوں کو اپنے حال سے آگاہ کر دوں۔ پھر میں نے اپنے جی میں کہا کہ "جو میں نے اپنے پروردگار کے ساتھ عہد کیا ہے اسے ہرگز نہیں توڑونگا" چنانچہ میں نے صبر کیا۔ اس کے بعد (ابھی تھوڑا ہی وقت گذرا تھا کہ) ایک اور جماعت آئی اور انھوں نے کنوئیں کا منھ کھول دیا۔ اس مرتبہ بھی میں نے چاہا کہ "فریاد کروں" لیکن میں نے پھر یہی کہا "میرا پروردگار بمقابلہ ان لوگوں کے مجھ سے زیادہ قریب ہے۔ اگر میں اس کے علم پر اکتفا کروں تو تھوڑی دیر اور خاموش رہوں۔ (اتنے میں) ناگاہ ایک شیر ظاہر ہوا اور اس نے اپنا پاؤں کنوئیں میں لٹکایا گویا وہ مجھے اشارہ کر رہا تھا کہ میں اس کے پاؤں میں لٹک جاؤں۔ چونکہ اس طرح شیر کا آنا قطعاً غیر فطری امر تھا اس لئے میں نے خیال کیا کہ یہ منجانب اللہ ہے۔ چنانچہ میں نے اس کا پاؤں پکڑ لیا اور باہر نکل آیا۔ تو ہاتف نے ندا دی: يَا اَبَا حَمْزَةَ اَلَيْسَ هٰذَا اَحْسَنَ نَجَّيْنَاكَ مِنَ التَّلَفِ بِالتَّلَفِ یعنی اے ابو حمزہ کیا یہ (امر) بہترین نہیں ہے کہ ہم نے تجھے ہلاکت سے ہلاکت کے ذریعے رہائی دی) (یعنی شیر

کنوئیں کا واقعہ جو حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔ آپ کے توکل کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس واقعہ کا ذکر حضرت شیخ علی ہجویریؒ "داتا گنج بخش" نے اپنی مشہور آفاق تصنیف کشف المحجوب میں بھی کیا ہے۔ آپ کی وفات ۲۹۲ھ / ۹۰۴ء میں ہوئی۔

کے ذریعہ جو خود انسان کو ہلاک کر دیتا ہے ہلاک ہونے سے بچا لیا)۔ اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ شیر آیا اور کنوئیں کا منھ کھول دیا (اور پاؤں کے ذریعہ نکال لیا)۔

حضرت ذوالنون رح کا اللہ پر بھروسہ

حضرت ذوالنون[1] مصری قدس سرہ کے بارے میں روایت ہے کہ وہ ایک گاؤں میں پہنچے جب رات ہوئی تو گاؤں والوں کو دیکھا کہ وہ بے حد پریشان ہیں، دروازے بند کر رہے ہیں اور مکانوں کے کونوں اور گوشوں میں چھپے جا رہے ہیں۔ حضرت ذوالنون رح نے پوچھا کہ "یہ کیا معاملہ ہے اور تم لوگ یہ سب کچھ کیوں اور کس کے ڈر سے کر رہے ہو؟" انھوں نے کہا "یہاں کا یہ معمول بن گیا ہے کہ جب رات ہوتی ہے تو ایک شیر جنگل سے نکلتا ہے اور جس کسی کو پاتا ہے مار ڈالتا ہے۔ ہمارا یہ خوف و ہراس اسی کی وجہ سے ہے۔" بشریت کے تقاضے کے مطابق ذوالنون رح کے دل میں بھی ہراس پیدا ہوا۔ انھوں نے چاہا کہ گاؤں کے لوگوں کی طرح وہ بھی چھپ جائیں۔ لیکن پھر وہ اپنے دل میں کہنے لگے کہ "فاعلِ حقیقی تو اللہ تعالیٰ ہے۔ فعل اسی کا فعل ہے اور ارادہ اسی کا ارادہ ہے، شیر کیا چیز ہے کہ اس سے ڈرا جائے: لَا تَتَحَرَّكُ ذَرَّةٌ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ (یعنی: کوئی ذرہ بھی ایسا نہیں جو اس کے حکم کے بغیر حرکت کر سکے)۔ (یہ سوچ کر) خدائے تعالیٰ پر توکل کیا اور گاؤں کے باہر اس جگہ جا بیٹھے جہاں شیر آیا کرتا تھا، اور رات وہیں گزار دی۔

علماء کا کہنا ہے کہ یہ اقدام جان کے ہلاک ہونے اور اس کو خطرہ میں جھونکنے کا موجب تھا اور شریعت میں یہ بات جائز نہیں: وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ (یعنی: اور جان بوجھ کر اپنی جان کو خطرہ اور ہلاکت میں نہ ڈالو)۔

اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہاں درحقیقت مراد عام مخلوق سے ہے کہ ان کی چشم بصیرت

---

[1] حضرت ذوالنون مصری کا نام ثوبان بن ابراہیم تھا کنیت ابوعبداللہ اور ابوالفیض تھی۔ مصر کے رہنے والے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ امام مالک رح سے علوم شرعیہ کی اور اسرافیل سے علم باطنی کی تکمیل کی تھی۔ صاحبِ کشف و کرامات بزرگ تھے۔ اہلِ ملامت کے پیشوا سمجھے جاتے ہیں۔ ۲ ذی شعبان ۲۴۵ھ کو فوت ہوئے۔ مزار مصر میں ہے۔

مشاہدۂ حق اور اس کے کاموں کو دیکھنے سے محروم ہے (ان کی چشمِ بصیرت سے حقیقت اور اللہ تعالیٰ کے کام چھپے ہوئے ہیں) لیکن اربابِ توحید و توکل کے لئے کہ جن کی نظرِ ہمت سے اسباب اور ذرائع ساقط ہو جاتے ہیں اور جن کو عین الیقین کے درجہ میں پہنچ کر معلوم اور ظاہر ہو جاتا ہے کہ بغیر اس کے ارادہ اور فعل کے کوئی بات واقع نہیں ہو سکتی۔ گوشۂ عافیت میں چھپ جانا اور جنگل میں جا کر بیٹھ جانا یکساں ہے۔ اَیْنَمَا تَكُوْنُوْا یُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ (یعنی تمھیں موت پا لے گی خواہ تم مضبوط برجوں میں بھی جا کر بیٹھو) واللہ اعلم

ابوالحسن نوری کے ایثار کا واقعہ

شیخ ابوالحسن نوری[1]، اللہ تعالیٰ ان کی تربت کو نورانی کرے۔ اپنے عزیز غلام کی جس کا نام احمد بن غالب تھا، اور جو صوفیہ کے گروہ کا انکار کرتا اور کفر و زندقہ میں مبتلا تھا مشقت کے بارے میں ذکر کرتے ہیں کہ جب خلیفہ نے فقراء کو گرفتار کرنے کا حکم دیا، اور اس جماعت کو جس میں نوری قدس سرہ بھی تھے مارنے کا فرمان جاری کیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ جلاد آیا اور اس نے تلوار کھینچ کر ایک طرف سے قتل کرنا شروع کر دیا۔ اس وقت شیخ سب سے پہلے دوڑے اور تواجد میں آ کر جلاد کے پاس جا کھڑے ہوئے تاکہ وہ ان کی گردن مارے۔ جلاد کہنے لگا "آخر تمھارا مقصد کیا ہے کہ تم سب سے پہلے خود کو قتل کے لئے پیش کر رہے ہو۔" آپؒ نے فرمایا "اس طریقے کے سلوک میں میری روش ایثار کی رہی ہے، اب جبکہ زندگیِ مستعار کا صرف ایک لمحہ باقی رہ گیا ہے، میں چاہتا ہوں کہ

---

[1] نام احمد بن محمد یا محمد بن محمدؒ اور لقب ابن بغوی تھا۔ آبا و اجداد بغشور کے رہنے والے تھے لیکن آپ بغداد میں پیدا ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کے نورِ باطن سے تاریک گھر بھی روشن ہو جاتا تھا۔ نیز اس نور سے مریدوں کے اسرار سے آگاہ ہو جاتے تھے۔ اس لئے آپ نوری کے لقب سے زیادہ مشہور ہیں۔ حضرت سری السقطیؒ کے مرید اور حضرت جنید بغدادیؒ کے اقران میں سے تھے۔ راہِ طریقت میں مجتہد کا درجہ رکھتے تھے۔ آپ کے طریقہ کو نوریہ کہا جاتا ہے۔ صاحبِ وجد و حال بزرگ تھے۔ ۲۹۵ھ/۹۰۸ء میں وصال ہوا۔

اس کو بھی اپنے بھائیوں پر قربان کردوں۔" جلاد یہ کلمہ سن کر حیران و ششدر رہ گیا۔ لوگوں نے یہ خبر خلیفہ تک پہنچائی۔ خلیفہ نے قاضی کو حکم دیا کہ وہ اس حال کی تفتیش کرے اور تحقیق کرے کہ آخر یہ کونسا گروہ ہے اور ان کا مذہب کیا ہے؟۔ قاضی نے نوری رحؒ سے عبادتوں، طہارت اور نماز وغیرہ کے بارے میں سوالات کئے۔ نوریؒ نے تمام سوالات کے تشفی بخش جوابات دیئے اور کہا: اَمَّا بَعْدُ هٰذَا فَاعْلَمْ اَنَّ لِلّٰهِ عِبَادًا يَسْمَعُوْنَ بِاللّٰهِ وَيَنْطِقُوْنَ بِاللّٰهِ وَيَرِدُوْنَ بِاللّٰهِ وَيَصْدُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَيَاْكُلُوْنَ بِاللّٰهِ وَيَلْبَسُوْنَ بِاللّٰهِ۔
(یعنی: پس جان کہ خدا کے بندے صرف اللہ کے لئے ہیں، وہ اللہ کے لئے "سنتے" ہیں، اور اللہ کے لئے بولتے ہیں، اور اللہ کے لئے آتے ہیں اور اللہ کے لئے نکلتے ہیں، اور اللہ کے لئے کھاتے ہیں اور اللہ کے لئے پہنتے ہیں)۔

قاضی کے دل پر نوری کے کلام سے ایک ہیبت طاری ہوئی اور اس نے زور زور سے رونا شروع کردیا۔ وہ خلیفہ کے پاس گیا اور اس سے کہا "اگر یہ جماعت زندیقوں کی ہے تو پھر روئے زمین پر ایک بھی مسلمان نہیں ملے گا۔

کافرانِ رہِ عشقیم اگر انصاف است　　　صد مسلمانِ تو اے خواجہ و یک کافرِ ما

(یعنی: ہم لوگ راہِ عشق کے کافر ہیں۔ اور اگر انصاف سے دیکھا جائے تو اے خواجہ تمھارے سو مسلمان اور ہمارا ایک کافر برابر ہے)۔

پس ان سب کو چھوڑ دیا گیا اور ان سے معذرت چاہی گئی۔

یہاں یہ کہا جاتا ہے کہ شیخ نوریؒ کا یہ تواجد اور ان کا جلاد کی طرف اتنی تیزی جانا اپنی جان کے قتل کے سلسلہ میں اس کی امداد کرنا تھا۔ اور شریعت کے فتوٰی کے مطابق یہ بات جائز نہیں۔ کیونکہ قتلِ نفس پر اعانت کرنا دوسرے کی املاک میں تصرف کرنے کے مانند ہے۔ آدمی کا وجود خود اس کی اپنی کوشش سے نہیں بلکہ وہ حق کی مرضی سے پیدا ہوا ہے۔ اس کو کیا حق ہے کہ وہ اپنی بقا یا اپنی فنا چاہے۔ اسے تو چاہیئے کہ وہ اس کے حدود سے واقف ہو۔ اسی لئے یہ بات ہے کہ اپنی جان کو ہلاک کرنا اور اس کے قتل میں مدد دینا شرع کے فتوٰی کے مطابق جائز نہیں۔ اور اس بحث سے جو کی گئی ہے خود یہ بات

لازم آتی ہے اور عبودیت کا ادب بھی یہی ہے۔ لیکن خدا جانتا ہے کہ جس حال اور مستی کا ان پر غلبہ ہوا وہ کہاں سے ہوا۔ اور اس وقت وہ سلوک و شہود کے کس مقام اور کس منزل میں تھے۔ نوری قدس سرہٗ بڑی شان کے امام اور حضرت جنیدؒ کے اقران میں سے نیز اربابِ سکر اور وجد و حال میں سے تھے۔

نوریؒ کا ایک اور واقعہ

ایک مرتبہ لوگوں نے حضرت جنیدؒ کے پاس یہ خبر پہنچائی کہ "تین دن ہوگئے ہیں کہ ابوالحسن نوریؒ نے کھانا نہیں کھایا ہے اور نہ وہ سوئے ہیں صرف اللہ اللہ کہتے اور تواجد کرتے ہیں۔" انھوں نے دریافت کیا "ان کی نمازوں کا کیا حال ہے؟" لوگوں نے کہا "نماز تو پڑھتے ہیں بلکہ جتنا وقت نماز میں گذارتے ہیں اتنے وقت تک ہوشیار رہتے ہیں۔ جب نماز سے فارغ ہوجاتے ہیں پھر وہی سرمستی طاری ہوجاتی ہے۔" انھوں نے فرمایا "اللہ کا شکر ہے کہ وہ محفوظ ہیں اور ان کی حالت درست ہے۔"

روایت ہے کہ حضرت جنید رضی اللہ عنہ غلام خلیل کی آزمائش کے موقع پر فقہا کے پاس گئے اور ابو ثورؒ[1] کے مذہب میں داخل ہوگئے اور اس طرح خود کو ان لوگوں کے شر سے نجات دلائی جو خدائے تعالیٰ کو بھولے ہوئے تھے۔ پھر جب شیخ ابوالحسن نوریؒ ان کے پاس آئے تو وہ غصہ اور عتاب کی حالت میں تھے، کہنے لگے "تم فقہا اور عقلا کے پاس ہو آئے ہو۔ لہٰذا اب ہم دیوانوں اور ناآشناؤں کے درمیان نہ آؤ اور اس راہ کی باتیں مت کرو۔" واللہ اعلم

---

[1] نام ابراہیم بن خالد کلبیؒ، کنیت ابو عبداللہ اور لقب ابو ثور ہے۔ بغداد میں تقریباً ۱۷۰ھ؁ میں ولادت اور ۲۷ صفر ۲۴۰ھ؁ کو ستر سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ مشہور ائمہ مجتہدین میں سے ہیں اور بہت سے مسائل میں جمہور سے منفرد ہیں۔ حافظ ذہبی نے ان کو الامام المجتہد الحافظ لکھا ہے امام مسلم، ابو داؤد اور ابن ماجہ تینوں آپ کے شاگرد ہیں۔

کسی شیخ کی نفس کشی کا واقعہ

ارباب احوال میں سے ایک کے بارے میں جو حضرت جنیدؒ کے مشائخ کے طبقہ میں تھے یہ بھی روایت ہے کہ ایک رات ان کو غسل کی حاجت ہو گئی۔ ہوا نہایت ٹھنڈی اور ان کا جسم نہایت کمزور تھا لہٰذا ان کے نفس نے گرانی اور سستی کی۔ پس نفس کی کراہت پر خرقہ کو بھی جو پہنے ہوئے تھے حوض کے اندر جو تمام کا تمام یخ بستہ تھا ڈال دیا۔ اس طرح روایت کی جاتی ہے کہ وہ خرقہ جو ان کے بدن پر تھا انتہائی وزنی تھا۔ اللہ تعالیٰ ہی کو خوب معلوم ہے کہ یہ بات مبالغہ سے کہی گئی ہے یا اس میں کچھ حقیقت ہے کہ ان کا خرقہ ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر تھا۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے اس خرقہ کو خشک نہیں کیا بلکہ اسی کو پہنے بیٹھے رہے اور سو بھی گئے۔ یہاں تک کہ کافی عرصہ کے بعد وہ خرقہ ان کے بدن پر ہی خشک ہو گیا۔
یہاں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ نفس کو عذاب دینا اور تکلیف پہنچانا ہے۔ ایک اعتراض یہ بھی کرتے ہیں کہ آخر اس طرح کا بھاری بھرکم خرقہ پہننے کے لئے آیا کہاں سے تھا۔

ایک بزرگ کا مجاہدہ

ایک اور بزرگ کے بارے میں یہ بھی روایت ہے کہ وہ ننگے پاؤں حج کو جا رہے تھے۔ اگر ان کے پاؤں میں کانٹے چبھتے تھے تو وہ ان کو نکالتے نہیں تھے۔ اور ان کی آنکھوں میں جو میل وغیرہ آجاتا تھا، اس کو اس نمدہ اور ٹاٹ سے صاف کر لیتے جو وہ پہنے ہوئے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ رفتہ رفتہ ان کے پاؤں ورم کر گئے اور آنکھیں جاتی رہیں اور وہ خود ہلاکت کے قریب پہنچ گئے۔

نفس کشی کا ایک اور واقعہ

(ارباب حال میں سے) ایک اور بزرگ کے بارے میں روایت کی جاتی ہے کہ تیس سال کی مدت سے ان کا دل ایک مخصوص کھانے کی خواہش کر رہا تھا لیکن وہ اس بات پر راضی نہ ہوئے کہ نفس کو وہ کھانا دیا جائے اور اس کی خواہش کو پورا کیا جائے۔

اتباع نفس کی سزا

ایک اور بزرگ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بھوکے تھے۔ کچھ روز بعد ان کو انگور کا ایک دانہ ایک ہرے پتے کے ساتھ جڑا زمین پر پڑا ہوا ملا۔ ان کے نفس نے بحالت اضطرار اس دانہ یا پتے کو زمین سے

اٹھایا اور منہ میں رکھ لیا۔ لیکن بعد کو انھوں نے اس کام کی پاداش میں اپنے نفس کو دو تین سال تک ریاضت و مجاہدہ میں رکھ کر گھلایا اور خود بھوک کی آگ سے جلتے رہے۔

نفس کے لئے علاج بالضد

اربابِ سکر و حال کے اس قسم کے افعال کی بہت سی مثالیں نقل کی گئی ہیں اور ان افعال کے کرنے میں ان حضرات کا قصد نفس کی ریاضت، حال کی تحقیق اور اس کے کنہہ و حقیقت تک پہنچنے کا ہوتا ہے۔ یہ باتیں نفس کا علاج کرنے والے اختیار کرتے ہیں۔ یہ بات لازمی ہے کہ علاج بالضد ہو۔ نفس کی حالت ایسی واقع ہوئی ہے کہ جب تک کام میں اتنی سختی نہ برتی جائے اور اس کو تنگی اور تکلیف میں نہ رکھا جائے اعتدال کے مرتبہ پر نہیں پہنچتا۔ اور اگر وہ لوگ نفس کے ساتھ رخصت کا معاملہ کریں تو وہ حق کے دائرے میں نہ رہے، اور اگر مطالبہ پختہ عزم ارادہ کے ساتھ کریں تو نفس مجبوراً اجازت دیدیتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ نفس کو مارنے کی ٹھان لیں تو وہ زحمت اور تکلیف گوارا کر لیتا ہے۔

فقہا کا اعتراض اور اس کا جواب

فقہا کہتے ہیں کہ ایسا کرنے میں نفس کو عذاب دینا حلال کو حرام کر لینا اور حدِ اعتدال سے تجاوز کرنا ہوا۔ اور یہ بات نصِ قرآنی اور احادیث کی رو سے ممنوع ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ○ (یعنی: اے ایمان والو! ان پاک چیزوں کو جنھیں اللہ تعالیٰ نے تمھارے لئے حلال کردیا ہے حرام مت کرو، اور اس طرح حد سے گذر جانے کے مرتکب نہ بنو کیونکہ اللہ تعالیٰ حد سے گذرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)۔

اس آیۂ کریمہ کا شانِ نزول یہ ہے کہ تمام صحابہ جمع ہو کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یارسول اللہ! ہم لوگ چاہتے ہیں کہ کھانا ترک کردیں اور اہل و عیال سے کنارہ کشی اختیار کریں اور صحرا کو نکل جائیں اور اِدھر اُدھر گھومتے پھریں۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ حکم نازل ہوا: لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا۔ نفس کے ساتھ نرمی اور اس کی مدارات کے بارے میں بہت سی حدیثیں ہیں۔

جواب اس کا یہ ہے کہ جیسی احادیث نفس کے ساتھ نرمی اور اس کی مدارات کرنے کے بارے میں وارد ہوئی ہیں ویسی ہی نفس اور خواہش کی مخالفت اور لذتوں اور خواہشوں سے خود کو بچانے کے سلسلہ میں بھی آئی ہیں۔ اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ریاضتیں، مجاہدے، سختیوں اور مصیبتوں پر برداشت اور فقر و فاقہ اور بھوک پیاس کی تلخیاں اتنی زیادہ تھیں کہ کسی کے لئے بھی اس معاملہ میں اُن کے ساتھ شرکت اور ان کی برابری کی مجال نہیں ہے۔ اوّل تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آسودگی اور سیری بالکل نہیں تھی۔ بعض غزوات میں آپؐ کو ایسی تنگ حالی سے سابقہ پڑا کہ اونٹ کی اوجھڑی کو نچوڑتے تھے اور جو چند قطرے اس میں سے ٹپکتے تھے اس سے آپؐ دہن تر کرتے تھے اور تجرد (اکیلے زندگی گذارنے) اور رہبانیت سے اس وقت منع کرنا اس بنا پر تھا کہ جہاد میں لوگ اکٹھے اور مجتمع ہوں اور اسلام کی بنیاد رکھی جائے۔ اس لئے کہ اس وقت اصل مقصد یہی تھا۔ درحقیقت صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال کے مشاہدہ، ایمان کی پختگی یقین کی قوت، حجاب کے اٹھ جانے اور شکوک و شبہات کے مٹ جانے کے سبب نفس کو تکلیف پہنچانے اور ریاضت کے تکلفات سے بے نیاز تھے: اِذَا طَلَعَ الصَّبَاحُ اَنْطَفَئَ الْمِصْبَاحُ (یعنی: جب دن نکل آتا ہے تو چراغ بجھ جاتا ہے)۔ اس کے باوجود بھی یہ روایت موجود ہے کہ حضرت عمرؓ کے لئے شربت لایا گیا لیکن آپ نے اس کو نوش نہ کیا اور فرمایا کہ "میں ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤں جن کی شان میں آیا ہے: اَذْھَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِیْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا (یعنی: تم اپنی دنیا کی زندگی میں اپنے (حصے کے) مزے اُڑا چکے)۔

اور اصحابِ صفہ کے فقر اور ان کی سختیوں کا حال کہ جو لفظی اور معنوی اعتبار سے مستند اور مستقل گروہ صوفیہ ہے، خود معلوم ہے کہ کیا رہا ہے۔

حضرت ابولبابہؓ کی پشیمانی کا واقعہ

حضرت ابولبابہ انصاری[1] رضی اللہ عنہ کے واقعہ کے بارے میں آپ کیا کہیں گے کہ

---

[1] اصل نام رفاعہ اور کنیت ابولبابہ تھی، والد کا نام عبدالمنذر تھا۔ آپ قبیلہ اوس سے اور رسول اللہ صلی اللہ

انھوں نے اس قصور کی وجہ سے جو بنی نضیر[1] کے قضیہ کے سلسلہ میں ان سے ظہور میں آئی تھی تصیح توبہ اور عذر خواہی کے لئے خود کو مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ستون سے باندھ کر کھانا پینا بند کر دیا تھا۔ اور بھوک اور پیاس کی وجہ سے نابینا اور بہرے ہو گئے تھے اور عہد کیا تھا کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آکر اپنے دست مبارک سے نہیں کھولیں گے وہاں سے نہیں ہلوں گا۔ (جب) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم (کو یہ اطلاع پہنچی تو آپ) نے فرمایا "میں کیا کروں۔ اگر وہ شروع میں میرے پاس آجاتے تو میں ان کے لئے استغفار کرتا اور پروردگار سے ان کی بخشش چاہتا۔ جب انھوں نے خود ہی اپنے کو درگاہِ خداوندی میں پیش کر دیا ہے تو خدائے تعالیٰ ہی ان کے بند کھولے گا۔ میں نہیں کھول سکتا۔" (آخر) دس بارہ دن کے بعد (جس کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے) قرآن

علیہ وسلم کے نقیب تھے۔ بیعت عقبہ کے موقع پر ایمان لائے۔ غزوۂ بدر کے وقت مدینہ منورہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم مقامی کا شرف حاصل ہوا۔ بدر کے بعد تمام غزوات میں شریک رہے۔ حضرت علیؓ کے دورِ خلافت میں انتقال ہوا۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ اور حضرت نافعؒ نے آپ سے حدیث کی روایت کی ہے۔

یہاں جس واقعہ کی طرف حضرت شیخ عبدالحقؒ نے اشارہ کیا ہے اس کا تعلق بنو نضیر سے نہیں بلکہ یہودیوں کے ایک دوسرے قبیلہ بنو قریظہ سے تھا۔ اس قبیلہ نے غزوۂ خندق کے وقت ۵ھ میں بدعہدی کی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غزوہ سے فراغت کے بعد اُس بستی کا محاصرہ کر لیا۔ بنو قریظہ نے خود میں مقابلہ کی سکت نہ پاکر درخواست کی کہ حضرت ابو لبابہؓ کو مشورہ کے لئے بھیج دیا جائے۔ جب حضرت ابو لبابہ پہنچے تو اُن کی آہ و زاری سے بیحد متاثر ہوئے۔ تاہم آپ نے مشورہ دیا کہ وہ خود کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ کر دیں لیکن ساتھ ہی گلے پر اُنگلی پھیر کر اشارہ کر دیا کہ قتل کر دیئے جائیں گے۔ اس انکشاف کے بعد حضرت ابو لبابہؓ کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ میں نے اللہ اور رسولؐ کی خیانت کی ہے۔ یہ سوچ کر مسجد نبوی میں تشریف لے گئے اور خود کو ایک ستون سے باندھ دیا۔ وہ ستون آج بھی ستون ابو لبابہؓ کے نام سے مشہور ہے۔

[1] یہودیوں کا ایک قبیلہ جو مدینہ منورہ کے جنوب مشرق میں آباد تھا۔ ۴ھ میں معاہدہ سے پھر گیا۔ آخر اس بستی کا محاصرہ کر لیا۔ تقریباً دو ہفتہ کے بعد اہلِ قبیلہ نے معافی مانگی اور وہاں سے چلے گئے۔

قرآن مجید، ابو لبابہؓ کی توبہ کے سلسلہ میں نازل ہوا۔ چنانچہ آپؐ تشریف لائے اور خود ان کے بندوں کو کھولا۔

اب دیکھئے ابو لبابہؓ کا خود کو مسجد نبویؐ کے ستون سے باندھ لینا اور کھانا پینا ترک کر دینا اور اس طرح خود کو ہلاکت میں ڈالنا آخر کیوں تھا۔ کیا یہ شریعت تھی۔ نہیں! شریعت تو صرف توبہ، ندامت اور عزم کا نام ہے۔ یہ تمام باتیں توبہ میں داخل نہیں۔ اگر نفس کو غذا نہ دینا اور ان کا اس قدر سختی وجہاد کرنا، مجاہدہ اور ریاضت کے مقام میں حرام اور ممنوع ہے تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس فعل سے کیوں منع نہیں فرمایا، اور اس کام سے کیوں باز نہیں رکھا۔ یہ بات غلبۂ حال وسکر اور وجد کے علاوہ کچھ نہیں تھی۔

صحابہؓ کے سکر و مستی کے واقعات

صحابہ رضوان اللہ علیہم پر بھی غلبۂ حال و مستی ہوتا تھا۔ آخر حضرت بلالؓ کا اس آیت کے نزول کے وقت مسجد میں وجد کرنا اور رقص کرنے لگنا: وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (یعنی: اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے)۔

اور حضرت عمر بن خطابؓ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صلح کفار سے حدیبیہ کے روز منع کرنا، اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قضیۂ افک کے موقع پر اپنی پاکیزگی اور بریت کے سلسلہ میں قرآن مجید کے نزول پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا شکریہ ادا کرنے سے انکار کرنا اور حضرت معاذ بن جبلؓ[1] کا ذکر کے جاری ہونے کے وقت یہ قول کہ وہ

---

[1] معاذؓ نام اور ابو عبد اللہ کنیت ہے۔ جلیل القدر صحابی تھے۔ مدینہ کے مشہور قبیلہ خزرج سے تعلق تھا۔ بیعت عقبہ ثانی میں حاضر تھے۔ بدر اور بعد کے تمام غزوات میں شریک رہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو قاضی اور معلم کی حیثیت سے یمن روانہ فرمایا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے امین الامت حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ کے بعد شام کا والی مقرر کیا لیکن اسی سال ۱۸ھ/۶۳۹ء میں طاعون کے مرض میں مبتلا ہو کر ۳۸ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ آپ سے عمرو بن العاصؓ اور عبد اللہ بن عمرؓ نے حدیث کی روایت کی ہے۔

اس امت کے لئے خصوصیت سے رحمت ہے۔ اے اللہ! معاذ اور اہلِ معاذ کو اس رحمت سے فراموش نہ کر۔ اور ان کا بیہوشی اور سکراتِ موت کے وقت یہ قول اِخْنُقْ خَنْقَكَ فَوَعِزَّتِكَ لَتَعْلَمُ اَنِّیْ اُحِبُّكَ (یعنی، گلا گھونٹ اپنا گلا گھونٹنا۔ تیری عزت کی قسم، تو جانتا ہے کہ میں تجھے دوست رکھتا ہوں) یہ سب وجد و مستی اور حال کے غلبہ کی وجہ سے تھا۔ واللہ اعلم۔

وصل ۱۲

مشائخ رح کا اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈالنا

مشائخ طریقت میں سے جو توحید توکل کے طریق کے سالک رہے ہیں۔ بعضوں کے متعلق روایت ہے کہ وہ بغیر سامان اور بلا کسی ساتھی کے ایسے صحراؤں اور جنگلوں میں جا پہنچے جہاں جان کا خطرہ تھا۔ وہاں ان کو حیران و سرگشتہ ہونا پڑا۔ فقہا کا ان سے نزاع و اختلاف ہے کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ وہ اسباب جو حکیم مطلق نے پیدا کئے ہیں ترک کرتے ہیں اور اپنے نفس کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں۔ یہ سب کچھ سنت کے خلاف ہے۔

جواب اس مسئلہ کے متعلق یہ ہے کہ حق سبحانہٗ و تعالیٰ نے جو اسباب کہ جریان عادت کے حکم سے پیدا کئے ہیں۔ اور مسببات کا ان کے ساتھ ربط و تعلق رکھنا ہے وہ تین قسموں پر ہیں۔

اسباب کی پہلی قسم

ایک قسم ان میں سے یقینی ہے کہ فعل کا تعلق اور اس پر اس کا موقوف ہونا ضروری ہے اور اس کا ختم کر دینا (سقوط) اور اس سے تجاوز کرنا عادتاً محال ہے کسی کے لئے بھی ان میں سے کسی ایک کا ترک کرنا ممکن نہیں اور اس کا ترک کرنا گناہ ہے۔ چنانچہ لقمہ اٹھانا اور منہ میں رکھنا اور اس کو چبانا اور حلق سے اتارنا۔ ان اسباب کو ترک کرنا توکل میں داخل نہیں ہے مگر یہ کہ حق تعالیٰ کسی کے حق میں اس کو خرق عادت کر دے، اور معجزہ اور کرامت کے طور پر اس کا اسقاط فرما دے۔

اسباب کی دوسری قسم

دوسری قسم اسباب وظنیہ کی ہے کہ جو عام حکم پر غالب ہے اور اس کے لئے عادت کا جاری ہونا ایک مدخل اور سبب کی حیثیت رکھتا ہے. لیکن یہ قسم طبائع کے اختلاف، عادت، ریاضت، تفاوتِ قوای اور افرادِ انسانی کی ہمتوں کے مطابق مختلف ہوجاتی ہے. مثلاً ایک شخص ہے جو اپنی طبیعت کی مضبوطی سے اور ہمت کو کام میں لاکر تین دن یا پانچ دن یا اس سے بھی زیادہ بھوکے رہنے کی طاقت رکھتا ہے، دوسرا ایسا ہے جس نے اپنی عادت اور ریاضت سے خود کو اس منزل پر پہنچا لیا ہے کہ اس کو دس دن تک کھانے کی حاجت نہیں ہوتی۔ اور بھوک کو ہلاکت تک نہیں پہنچاتی۔ اور اگر ایسا ہوتا ہے تو درختوں کے پتے جنگل کی گھاس پھوس اور اسی قسم کی اور چیزیں کھاکر بھوک کو دفع کر دیتا ہے۔ یا باطن کی سیری کو نورِ یقین، غذائے روحانی اور عشق و محبتِ الٰہی کے غلبہ سے دور کرتا ہے۔ چنانچہ مشائخ طریقت میں سے ایک سے لوگوں نے دریافت کیا "آپ کی قوت کیا ہے؟" انھوں نے کہا "اللہ تعالیٰ اور اس کی قدرت پر اس بھروسہ کے ساتھ کہ وہی رزق اور موت کا دینے والا ہے اور اس یقین کے ساتھ کہ زندگی اور بقا کا اصل سبب قدرت باری تعالیٰ ہے۔ نہ کہ کھانا اور پانی —
"ذکر الحی الذی لا یموت" (میری قوت ہے)

پس اگر ایک شخص دس دن تک بھوکا رہنے کی عادت ڈال لے اور دوسرا دس دن تک بغیر سامان کے سفر کرے تو وہ گنہگار کیوں ہوگا اور واجب کا ترک کرنے والا کیسے سمجھا جائے گا۔ اس کو ان عام لوگوں پر قیاس کرنا جو ایک دن کی بھی بھوک اور پیاس برداشت نہیں کرسکتے درست نہیں ہے۔ اور مشائخ طریقت میں سے یہ امر نہایت صحت کے ساتھ پہنچا ہے کہ وہ ریاضت اور عادت ڈالنے سے رفتہ رفتہ طے اربعین ایک مدت معینہ میں حاصل کر لیتے ہیں۔ پس سالکین جو مرتبہ توکل و یقین پر پہنچ گئے ہیں جنھوں نے ریاضت و مجاہدہ کیا ہے

اور جن کو مشاہدہ توحید حاصل ہو چکا ہے ان کے حق میں ان اسباب کی رعایت رکھنے کا وجوب ساقط ہو جائے گا۔ واللہ اعلم

ایک بزرگ کے بارے میں روایت ہے کہ ان کا بارگاہِ خداوندی میں عہد تھا کہ دس روز یا زیادہ جیسا کہ نقل کیا گیا ہے بغیر کھانے اور پانی کے گذاروں گا۔ اتفاق سے اپنے کسی سفر میں دس روز بھوکا رہ کر گذارے اور دس دن کے بعد زمین پر گر پڑے اور مجبور ہو گئے۔ پیروں نے چلنے سے جواب دے دیا اور سفر کی طاقت باقی نہ رہی، مناجات کے لئے ہاتھ اٹھائے اور عرض کی: "بار خدایا! دس روز گذرے اور ابھی سے یہ حال ہے کہ بھوکا رہنے کی طاقت نہیں رہی۔ اب تیرا کیا حکم ہے۔" اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ "تو غذا چاہتا ہے یا قوت۔" انھوں نے کہا "مقصد اصلی تو قوت ہے کہ اس سے میں راستہ طے کر سکوں۔" جواب ملا "ہم قوت دیتے ہیں تو اس کا غم مت کر۔" پھر وہ اتنی مدت تک جتنا کہ خدا نے چاہا تھا بغیر کھائے سفر کرتے اور قوتِ روحانی کے غلبہ اور خدائے تعالیٰ کی تائید و تقویت سے سیاحت کرتے رہے۔

اسباب کی تیسری قسم

تیسری قسم اسباب وہمیہ کی ہے جو کلیتہً وہم سے پیدا ہوتا ہے۔ یعنی یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ اگر ان اسباب کو میں خود فراہم نہ کروں تو ہلاک ہو جاؤں گا۔ چنانچہ ایک شخص کہتا ہے کہ اگر آج میں کل کے اسباب کی فراہمی کا تہیہ نہ کروں تو کیا حال ہو گا اور کس طرح بسر کر سکوں گا۔ یہ خالص وہم ہے۔ اور ان اسباب کا اتباع اور رعایت توکل کے منافی ہے۔ مگر جس جگہ اس کے فقدان کا غلبہ ہو وہاں وہ پھر اسبابِ عادیہ کی جانب لے جاتا ہے اور اس کا حکم معلوم ہی ہے۔ مثلاً جنگل میں جانے سے اجتناب کہ اس جگہ درندہ کا وجود عرف اور عادت کے حکم میں داخل ہے اور اسباب عادیہ سے ہے۔ اگرچہ کسی نے بھی وہاں کبھی کوئی درندہ نہیں دیکھا مگر شاذ و نادر، تاہم محض اس وہم اور احتمال کی بنا پر کہ شاید خلافِ عادت اس کا وجود ظاہر ہو جائے اور وہ مار ڈالے۔ یہ حکم وہم ہے اور توکل کی حقیقت کے منافی

ہے اور اسی طرح خواب اور سیلاب اور وہ جگہ جو سیلاب کے پھوٹ نکلنے کا عادتاً محل ہے ظنی چیز ہے۔ اور جس جگہ کہ سیل بالکل نہیں آیا لیکن نفس الامر میں عقلاً اس کا امکان ہے کہ شاید پیدا ہو جائے، یہ وہم ہے۔ هٰذَا هُوَ الْقَوْلُ الْفَصْلُ وَعَلَيْهِ التَّعْوِيلُ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ۔ (یعنی: یہ جو کچھ مذکور ہوا حق اور باطل کے درمیان فصل پیدا کرتا ہے۔ اور اسی پر بھروسہ ہے اور اللہ حق بات کہتا ہے اور راہِ ہدایت پر چلاتا ہے)۔

حاصل کلام یہ کہ اربابِ احوال کے (جو خدا کی راہ کے صادق لوگ اور اس کی درگاہ کی طرف متوجہ رہنے والے ہیں) احوال و اقوال میں توقف اور تسلیم و رضا کی خوبی معلوم و مسلم ہے۔ اس باب میں غور و خوض ضروری ہے کیونکہ بغیر کسی مصلحت و ضرورت کے انکار کر دینا خطرہ سے خالی نہیں۔ أَسْلِمْ تَسْلَمْ (اسلام اختیار کر لے سلامت رہے گا) یہ اس گروہ کے حق میں نہایت ادنیٰ مرتبہ ہے۔ اس گروہ کے حق میں تو راستی، تسلیم و انکار میں برابر ہے اور نہ تمہارے فائدہ کے لئے نہ نقصان کے لئے۔ لیکن اگر توفیق ساتھ دے اور کام کے شروع ہی میں پتہ چل جائے۔ نیز باطن میں ان پر حال اور وجد کی کیفیت طاری ہو جائے تو وہ ایک دوسری ہی بات اور ایک اور قسم کی سعادت ہے جو کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ بہر حال تجھے اعتقاد اور ایمان کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہیئے۔ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہمارے طریقہ میں ایمان جو ولایت میں سے ہے یہ ہے: "اوسط و اعتدال کا راستہ ہر کمال کی جڑ اور اس کا بلند ترین سرا ہے۔" واللہ الموفق۔

مؤلف کتاب کے اشعار

اے مخالف اربابِ حال تو اپنا کام کر۔ کہ یہ ایک دوسرا ہی راستہ ہے۔ ہر شخص الگ الگ کاموں کے قابل ہوتا ہے لیکن یہ بات ذہن میں رکھ کہ انکار مت کر، خدا کے لئے اس کام کی مخالفت نہ کر، درویشوں (درگاہِ بے نیاز کے محتاجوں) کی حالت کو دیکھ اور ان کے عشق کی کوشش و شورش پر نظر رکھ کہ وہ اس راستہ میں کیسی طلب رکھتے ہیں اور اس طلب ہی کی وجہ سے کیسی سختی جھیلتے ہیں۔ اگر اس طلب سے ان کا مقصد خدائے تعالیٰ کو پانا نہیں ہے تو آخر یہ سب دوڑ دھوپ ان کی کس وجہ سے ہے، طلب میں ان کی ید

ساری جانبازی کیا ہے اور اپنا مال و اسباب کس لئے فدا کر رہے ہیں۔ کشف اگر کوئی چیز نہیں ہے تو تمہارا قیاس کیا چیز ہے۔ عقل جو تیرے حواس کا درک و ادراک ہے کہاں سے آئی ہے۔ بہرحال اگر تجھے وجد میسر نہیں ہے تو کم از کم اس پر اعتقاد رکھ اور ایمان لے آ۔

وصل ۱۳

وہ باتیں جن میں مشائخ و علماء کا اجماع ہے

اب ہم (چاہتے ہیں کہ) مشائخ کے کلام میں سے وہ باتیں بیان کریں جو اس چیز (وجد و حال) کی موافقت اور تقویت کے لئے ہیں جو ہم نے (اوپر) بیان کی ہیں تو یہ مناسب ہوگا۔ تاکہ طالب کو حق بات کے بارے میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے۔ تصوف کی کتابوں میں جن کی صحت پر دونوں طرف کے لوگوں کا اجماع ہے اور جن پر دونوں فریق متفق ہیں اس کی تصریح موجود ہے لیکن ہم نے کتاب "قواعد الطریقۃ فی الجمع بین الشریعۃ والحقیقۃ" سے کہ جو الشیخ الامام الہمام قدوۃ المتاخرین حجۃ المتقدمین صاحب الطریق القویم والداعی لخلق اللہ الیٰ صراط المستقیم الامام العالم العامل الکامل القیم للعدل الفاروق شہاب الحق والحقیقت والشرع والدین سیدی احمد المغربی البرنسی عرف بہ زروق کہ جو اکابر علمائے وقت اور اعاظم مشائخ مغرب سے تھے اور جن کو دیارِ عرب کے تمام مشائخ تسلیم کرتے تھے رحمۃ اللہ علیہ واسعۃ کاملۃ کی تصنیف ہے نقل کیا ہے اور جب اہل حق اور اربابِ تحقیق سب کی ایک ہی رائے ہے تو پھر ایک کے کلام سے نقل کر دینا ایسا ہی ہے جیسا سب کے کلام سے نقل کرنا۔ اور چونکہ کتاب مذکور میں مسائل کے عنوانات کے لئے لفظ قاعدہ استعمال کیا گیا ہے اس لئے ہم بھی اس موقع پر لفظ قاعدہ ہی کو کام میں لاتے ہیں۔ توفیق کا دینے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

قاعدہ (۱)

فقہ کا حکم عام اور تصوف کا خاص ہے

فقہ کا حکم عام ہے اس میں تمام مخلوق شامل ہے اور خواص و عوام

سب اس کے محکوم ہیں۔ اس لئے کہ اس کا مقصد شریعت کے مراسم کا قیام اور دین وملت کے جھنڈوں کو بلند کرنا ہے۔ فقہ کی بنیاد علم پر ہے۔ اس لئے اس کے قواعد وضوابط کلیہ کا حکم رکھتے ہیں اور افراد واشخاص کے اختلاف کی وجہ سے بدلتے نہیں۔ تصوف کا حکم خاص ہے۔ یعنی وہ مخصوص ہے۔ صرف اہل قرب وخصوص کے لئے اس لئے کہ وہ پروردگار اور بندہ کے درمیان ایک معاملہ ہے۔ اس کا مدار ذوق اور حال پر ہے۔ اس کے احکام ایسے جزئیات ہیں جو حال، وجد اور ذوق کے اختلاف سے بدلتے رہتے ہیں۔ اور اسی لئے یہ بات ہے کہ فقیہ کو صوفی کو حکم دینا اور کسی بات سے منع کرنا صوفی کے لئے صحیح ہے لیکن صوفی کا فقیہ کی کسی بات سے انکار درست نہیں ہے بلکہ صوفی کا احکام کے لئے فقیہ سے رجوع کرنا ضروری ہے تاکہ وہ ان پر عمل کرے۔ اور حقائق کے بارے میں بھی تاکہ وہ شریعت کے خلاف نہ چل پڑے۔ چنانچہ یہ حکم ہے کہ ہر وہ حقیقت جو شریعت کو رد کرتی ہو سراسر زندقہ ہے۔ فقہ کے لئے ضروری نہیں کہ وہ احکام میں صوفی سے رجوع کرے۔ پس تصوف شریعت کا محتاج ہے اور فقہ تصوف سے مستغنی ہے۔ اگرچہ تصوف مرتبے کے لحاظ سے فقہ سے اعلیٰ وارفع ہے لیکن فقہ مصلحت میں اسلم اور اعم (جس کو سب جانتے ہیں) ہے۔ اور اسی کی بنیاد پر کہا گیا ہے کہ "کُنْ فَقِیْهًا صُوْفِیًّا وَلَا تَکُنْ صُوْفِیًّا فَقِیْهًا" (یعنی فقیہ صوفی بن اور صوفی فقیہ نہ بن) یعنی پہلے فقاہت اور شریعت کے عمل اور ظاہر کی حفاظت کر اس کے بعد مقام تصوف، اتصاف، حقیقت اور باطن کی صفائی کی طرف ترقی کر۔ اس لئے کہ یہ چیز سب سے مکمل، سب سے زیادہ پوری اور سب سے زیادہ مسلم ہے، عملاً بھی حالاً بھی اور ذوقاً بھی۔ اور صوفی فقیہ نہ بن، یعنی اول ہی سے تعلق حقیقت، توحید اور مواجید باطن سے مت قائم کر۔ اس لئے کہ اس کے بعد ظاہر کی رعایت اور شریعت کے اتباع میں مضبوطی پیدا نہیں ہو گی جیسا کہ فرمایا ہے "وَلَا یُقَدِّمُ الْبَاطِنَ عَلَی الظَّاهِرِ وَلَا یَکْتَفِیْ بِالظَّاهِرِ عَنِ الْبَاطِنِ (یعنی: مت مقدم رکھ باطن کو ظاہر پر اور نہ کافی سمجھ ظاہر کو باطن کے بغیر)۔ اس میں یہ وصیت کی گئی ہے کہ مرید کو چاہیئے کہ حقیقت کے باطن کو شریعت کے ظاہر پر مقدم نہ رکھے تاکہ مذہب باطنیہ میں نہ چلا جائے اور الحاد میں نہ مبتلا ہو جائے (معاذ اللہ) اور باطن کے بغیر ظاہر پر اکتفا نہ کرے تاکہ اہل قشر و تقشف میں

شامل نہ ہو اور صرف فقاہت پر توقف نہ کرے اور انوار و اسرار سے محروم نہ رہے۔ فقہ سے تصوف کی جانب رجوع زیادہ طلب اور ترقی کے شوق اور کمال کے حصول کی پیاس کے باعث آسان ہے۔ لیکن تصوف سے فقہ کی جانب رجوع ذوقِ باطن کے استیلا اور حقیقت کے غلبہ کے بعد دشوار ہے۔ پس پہلے شریعت کے عروۃ الوثقیٰ اور فقاہت کے ساتھ تمسک کرے اس کے بعد حقیقت اور تصوف کی بلند ترین چوٹی تک رسائی پائے۔
فقاہت اسلام کا مرتبہ ہے۔ کلام ایمان کا درجہ ہے اور تصوف مقامِ احسان ہے۔ چنانچہ حدیثِ جبرئیل علیہ السلام میں یہ تینوں مقام بیان کئے اور تفصیل سے دیئے گئے ہیں:
اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ رَبَّكَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ (یعنی: احسان یہ ہے کہ عبادت کر اپنے رب کی گویا تو اسے دیکھ رہا ہے) (الحدیث) اور امام مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "جو صوفی ہوا اور فقیہ نہ ہوا وہ زندیق ہے اور جس کسی نے فقہ حاصل کیا لیکن تصوف اختیار نہ کیا اس نے فسق کیا۔ اور جس کسی نے ان دونوں چیزوں کو ملایا وہ تحقیق کی منزل پر جا پہنچا۔" حاصل کلام یہ کہ کمال کا مرتبہ فقہ صحیح اور ذوقِ صریح ہے۔ اور دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دینا زوال اور نقصان کا موجب ہے۔ چنانچہ علم طب ہی کو لے لیجئے بغیر تجربہ کے یہ علم کافی نہیں ہے۔ اور طب کا تجربہ بغیر اس کے علم کے کام نہیں دیتا۔
واللہ اعلم

قاعدہ ۲۷

کیا صوفی کا کوئی مذہب نہیں

تشعب (شاخ در شاخ ہونا) اصل اور اس کا تفرق موجب تشعب ہے۔ اور تذبذب فرع ہے لہٰذا توحید کو برہان اور تحقیق کو مستند ہونا چاہیئے۔ اور فرع کو اصل کے ساتھ کہ ان پر رجوع اور اعتماد کیا جاتا ہے مضبوطی کے ساتھ تھامنا چاہیئے تا کہ کام کے کرنے میں جد و جہد کا عنصر شامل ہو جائے اور کامیابی ظاہر ہو۔ کیا فقہ، کیا کلام اور کیا تصوف امام، ہادی اور شیخ ایک ہی ہونا چاہیئے۔ پس یہ جو کہا جاتا ہے کہ صوفی

کا کوئی مذہب نہیں، صحیح نہیں۔ مگر اسی ایک مذہب کی روایات سے اخذ و اقتباس ادنیٰ و احوط ہے۔ جس کے اتباع کا التزام کیا گیا ہے۔ خواہ اس مذہب کے عام ائمہ کا وہ قول نہ ہو، طریقت کے تمام ائمہ اور ملت کے جملہ اساطین فقہا کے مذہب کے تابع رہے ہیں۔ چنانچہ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی قدس سرہ، حضرت سفیان ثوری[1] کے مذہب پر تھے۔ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہ مذہب امام حنبل ؒ میں، اور حضرت شیخ شبلیؒ مذہب امام مالکؒ میں، اور جریری[2] ؒ امام اعظمؒ کے مذہب میں۔ اور حارث محاسبی مذہب شافعی[3] رکھتے تھے رضی اللہ عنہم۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ صوفی کا مذہب جزئیات میں صاحبِ حدیث کا تابع ہے، یہ بات اس اعتبار سے ہے کہ اپنے مذہب پر عمل روایت کے مطابق کرتا ہے جو نص حدیث کے موافق ہے اور یہ بھی اس صورت میں ہے کہ وہ احتیاط کے مخالف اور ورع کے خلاف نہ ہو۔ اگر علما کے مذاہب میں جمع ارشد و احوط (سب سے زیادہ احتیاط کے ساتھ) ظاہر ہو تو یہ بھی جواز کی صورت رکھتا ہے لیکن نرم اور آسان چیز کا تتبع جائز نہیں ہوگا۔ واللہ اعلم

---

[1] آپ کا نام سعید اور کنیت ابو عبد اللہ ہے۔ حضرت امام اعظمؒ کے ارشد تلامذہ میں آپ کا شمار ہے۔ علوم ظاہر باطن میں یکتائے روزگار تھے۔ چنانچہ پانچ مجتہدوں میں سے ایک آپ بھی ہیں۔ آپ نہ صرف ایک بڑے راوی حدیث ہیں بلکہ جتنی حدیثیں آپ نے سُنیں ان پر عمل بھی کیا۔ ۲ر شعبان ۱۶۱ھ کو بصرہ میں انتقال ہوا۔

[2] شیخ احمد ابو محمد جریریؒ، حضرت جنید بغدادی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ فقہ اور اصولِ فقہ کے امام سمجھے جاتے ہیں۔ طریقت میں بھی نہایت بلند درجہ تھا۔ آپ کی وفات ۳۱۴ھ/۹۲۵ء میں قرامطہ کے حملہ کے وقت پیاس کی شدت سے ہوئی۔

[3] اصل نام محمد بن ادریس، کنیت ابو عبد اللہ اور لقب شافعی ہے مکہ معظمہ کے قبیلہ قریش سے تھے اور آٹھویں پشت پر سلسلۂ نسب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد عبد المطلب سے مل جاتا ہے اسی لئے آپ کو امام ہاشمی مطلبی کہا جاتا ہے۔ ۱۵۰ھ میں بمقام منیٰ ولادت ہوئی مکہ میں تعلیم پائی پھر مدینہ منورہ میں حضرت امام مالکؒ کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ وہاں سے کوفہ و بغداد گئے اور امام محمد شیبانیؒ اور امام ابو یوسفؒ سے اکتساب فیض کیا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر مصر میں مقیم ہو گئے اور وہیں ۲۰۴ھ/۸۱۹ء میں بعمر ۵۴ سال انتقال فرمایا۔

قاعدہ ۳

کتاب و سنت کا اتباع ضروری ہے

فرع کا اعتبار اصل اور قاعدہ سے ہے اور اصل اور قاعدہ کتاب و سنت ہے۔ پس جو قول بھی ہو اور جس قائل سے بھی ہو خواہ وہ فقیہہ سے ہو، متکلم سے ہو یا صوفی سے ہو اصل اور قاعدہ ہے اس کو قبول کرے۔ لیکن اگر اہلیت رکھتا ہو رد کردے۔ اور اگر تاویل کے قابل ہے تو تاویل کی راہ چلے۔ اور اگر تاویل پذیر نہیں ہے اور اس کا قائل، علم و دیانت میں پورا ہے تو اسے مان لے۔ ہر صورت میں نہ حقیقی طور پر کوئی تردید کرنے والا ہے اور نہ اس کے قاعدے پر کوئی وقیع اعتراض ہی ہے اس لئے کہ فاسد کا فساد بھی اس سے رفع ہو جاتا ہے اور نیک آدمی کی نیکی کو بھی اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ پس غالی قسم کے صوفی متکلین اور فقہ میں مطعون لوگوں پر اہلِ ہوا کا حکم لگایا جاتا ہے۔ ان میں سے کسی کا بھی قول و فعل مسلم اور مقبول نہیں ہے۔ بلکہ ان کے قول کا رد لازم اور ان کے فعل سے اجتناب واجب ہے۔ مذہبِ حق کو ترک کرنا اور اس بات میں جو یقین سے ثابت ہے توقف اور تردد کرنا خواہ وہ قول سے ہو یا اس فعل سے جو ان سے منقول یا منسوب ہے جائز نہ ہوگا۔ "جو کچھ ہونا ہے ہوتا رہے۔" کا اصل ہر کسی پر نہیں چلنا چاہیئے۔ اور ہر کسی کی بات پر کان نہیں دھرنا چاہیئے۔ جس کا اتباع حقیقی اور صحیح ہے وہ شارع علیہ السلام ہیں اور جو کوئی آپؐ کے علاوہ ہے وہ آپؐ کا تابع ہے۔ کتاب و سنت حجت ہے اور جو کچھ اس کے علاوہ ہے اس سے اجتناب ضروری ہے۔

قاعدہ ۴

کلام میں اشکال و ابہام کا سبب اور اس کا حکم

ایسا اشکال اور ابہام اگر کلام میں موجود ہو کہ بغیر تامل و تکلف اس سے منع کیا گیا ہو اور ممانعت کو ماننا لازم ہو تو اس کا حکم وہ ہے جو پچھلے

قاعدہ میں مذکور ہوا۔ لیکن اگر الزام اور اشکال کا قائم کرنا تکلف اور تامل کے ساتھ ہوا ہے اور ظاہر کلام صحیح اور واضح ہے تو اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ اس لئے کہ تامل اور تکلف کے بعد اشکال کے عارض ہونے سے خلو کلام اس کے ایجاد اور ایراد میں نادر اور اقل قلیل کا درجہ رکھتا ہے اور اگر اشکال اور عدم اشکال کا لزوم عقل میں متبادر (جلد آنے والا) متجاذب (ایک دوسرے کو کھینچنے والا) اور برابر ہوں تو بلاشک کلام کے تجاذب کے حکم پر کلام بھی مشکوک اور متنازع فیہ ہو جاتا ہے۔ کلام میں اشکال کبھی تو معنی و مفہوم کی زیادتی اور عبارت کی تنگی کی وجہ سے ہوتا ہے اور کبھی اصل کلام میں کچھ گڑبڑ ہوتی ہے اور جو مفہوم اس میں دیا گیا ہے اس میں انتشار و اختلال ہوتا ہے لیکن اس گروہ کے کلام میں اشکال و ابہام کا وجود اصل میں قسم اول سے ہے اس لئے کہ ان کا مقصد و مقصود غایت نزاکت اور بلندی میں ہے ہر چند کہ اس کی فصاحت و وضاحت میں کوشش کرتے ہیں لیکن زیادہ مشکل اور موہوم نہیں ہوتا۔ اور منکروں کے نزدیک دوسری قسم سے ہے۔ بہر حال اس میں ہر شخص معذور ہے۔ اگر کوئی معتقد پرہیز اور یکسوئی نہ اختیار کرے تو وہ بھی خطرہ میں ہے۔ امن اور سلامتی تفویض اور تسلیم میں ہے۔ واللہ اعلم

قاعدہ ۵

علم اور حال کا فرق علم کی بنیاد بحث اور تحقیق پر ہے اور حال کی بنیاد تسلیم اور تصدیق پر۔ پس عارف اگر علم کی حیثیت سے باتیں کرے تو اس کی نظر اصولِ علم پر کہ جو کتاب، سنت اور آثار سلف ہے) پڑنا لازم ہے۔ اس لئے کہ علم کا اعتبار اس کی اصل اور دلیل کے ساتھ ہے۔ اور اگر بات کی جائے، حال کے اعتبار سے تو اس کے لئے تسلیم کے سوا چارہ نہیں ہے اس لئے کہ وصول اور اس کی حقیقت کا علم سوائے اس حال کے اور کسی طرح میسر نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اس کا اعتبار اس کے ذوق و وجدان پر ہو گا۔ اور اس چیز کا علم صاحبِ حال کی اعانت سے مستند ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اتباع اور اقتدا نہ ہونا چاہیئے سوائے ایسے شخص کی جو اس حال میں اس کے

ساتھ ایک ہو گیا ہے۔ ایک استادِ طریقت اپنے مرید سے خود فرماتے تھے "اے میرے بیٹے پانی کو ٹھنڈا کر کے پیو کیونکہ ٹھنڈے پانی کے پینے سے دل کے اندر سے شکر ادا ہوتا ہے۔ پس اس شخص یعنی سری السقطی[1] قدس سرہ کے بارے میں تم کیا کہتے ہو کہ ان کے پانی کے ہر برتن پر دھوپ آجاتی تھی اور وہ نہیں اُٹھاتے تھے۔ کہتے تھے کہ "مجھے شرم آتی ہے کہ اس کو صرف حظِ نفس کی خاطر اُٹھاؤں۔" ان کا کلام صاحبِ حال کا کلام ہے اس لئے ان کی اقتدا صحیح نہیں۔ واللہ اعلم

قاعدہ ۹۷

صاحبِ وجد و حال کے لئے احکامِ شرعیہ کی قضا لازم ہے

صاحبِ وجد اور صاحبِ حال کا وجد اور حال جب اس مقام پر پہنچ جائے کہ اختیار کی باگ ڈور اس کے ہاتھ سے چھوٹ جائے اور وہ اپنے نفس کا مالک نہ رہے تو وہ معذور ہے اور اس حالت میں اس پر مجنون کا حکم لگتا ہے۔ اس لحاظ سے کہ اس پر افعال کا اعتبار ساقط اور احکامِ تکلیفیہ کا جاری ہو جانا معدوم ہو جاتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس کے وجد و حال کی تحقیق ہو سکے اور وہ صحیح ثابت ہو کر تکلیف اور اختیار کے شائبہ سے خالی ہو جائے۔ اس حالت میں اس سے جو چیز بھی فوت ہو جائے گی فائت (چھوٹ جانے والی چیزوں) کا استدراک اور فوت ہونے والی اشیاء کی قضا لازم آئے گی۔ اسباب کے سبب بنانے اور وجود کرنے میں کسب اور اختیار کے وجود کا اعتبار

---

[1] حضرت شیخ سری بن المغلس السقطیؒ کی کنیت ابوالحسن ہے۔ شیخ معروف کرخیؒ کے مرید اور خلیفہ اور حضرت جنید بغدادیؒ کے ماموں اور مرشد تھے پھلوں کی تجارت کرتے تھے لیکن نفع بہت کم لیتے تھے۔ علم میں کامل و ماہر اور صاحبِ تصرف بزرگ تھے۔ حضرت جنید بغدادیؒ کا کہنا ہے کہ میں نے عبادت میں ان سے زیادہ کسی کو کامل نہیں پایا۔ ۳ رمضان ۲۵۳ھ / ۸۶۷ء کو منگل کے دن بغداد میں وصال ہوا۔

ہے جیسے سکران (نشہ) کہ اگرچہ حالتِ سکر پر وہ قدرت اور اختیار نہیں رکھتا لیکن چونکہ اس حالتِ سکر کا حصول خود اس کے ارتکاب اور اختیار سے ہوتا ہے تو فوت ہونے والی چیزوں کی قضا اس پر واجب ہے بخلاف اصلی مجنون کے۔ عذر اور مواخذہ کے رفع ہو جانے کے باوجود اس فعل میں اس کا اقتدا جائز نہیں ہوگا اور اس کی متابعت روا نہیں ہوگی۔ مثلاً حضرت ابوالحسن نوریؒ کا جلاد کے نزدیک وجد کرنا، اور حضرت ابوحمزہؒ کا کنوئیں میں ٹھیرنا، اور حضرت شیخ شبلیؒ کا حال ڈاڑھی کے مونڈنے میں اور نئے کپڑے کے پھاڑ ڈالنے میں، اور سمندر کے اندر مال کے ملنے میں۔ اور اسی طرح کی اور مثالیں بھی ہیں۔ ان کے ان اعمال کے ظاہر سے جو وجد اور حال کے غلبہ کی وجہ سے سرزد ہوئے۔ چنانچہ ایسی روایتوں کی ایک طویل فہرست ہے جو بیان کی جاتی ہیں۔ سماع کی حالت میں رقص اور وجد بھی اسی قبیل سے ہے اگر تکلیف کی آمیزش اور اختیار اور قصد کے دخل کے بغیر صرف اس وجہ سے کہ اس سے صبر کرنا اور رکنا ممکن نہ ہو صادر ہو جائے اور ضبط کے دائرہ اور حفاظت کے امکان سے خارج ہو تو اس کا کرنے والا معذور ہے۔ اور تحقیق اور صحت کی صورت میں اس کا حال مسلّم ہوگا انکار میں مبالغہ اور اعتقاد میں تعصب نہیں ہونا چاہیئے۔

جب ایک مجنون عورت حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئی اور مرگی اور جنون سے جو اس کو لاحق تھا اور ستر عورت کو ظاہر کرنے اور بری حرکتوں کی وجہ سے کہ جو اس وقت اس سے سرزد ہوتی تھیں اس نے آپؐ سے شکایت کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اگر تو چاہے تو صبر کرتا کہ تجھے مصیبت اور تکلیف کی جزاء بہشت بریں دی جائے اور اگر چاہے تو میں دعا کروں اور پروردگار جل شانہ سے درخواست کروں کہ وہ تجھ کو صحت اور اس بلا سے نجات دے۔" وہ عورت اس بات پر راضی ہوگئی کہ صبر کرے اور بہشت میں جائے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کو جنون و طلب شفا پر اختیار دینا اور آپؐ کا اس کو جنون کے اختیار کرنے میں اقرار کرانا اور سنوانا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ افعال نامرضیہ کی شکل میں اس سے جو امور سرزد ہوئے اس میں

وہ معذور تھی اور اس سے اس کو کوئی ضرر بھی نہیں پہنچتا تھا۔

قاعدہ ۷

درجۂ کمال پر فائز ہونے کے بعد بھی شریعت کے احکام ساقط نہیں ہوتے

زیادتی اور کمال کا ثابت ہوجانا احکامِ تکلیفیہ کے رفع ہونے اور حدودِ شرعیہ کے ساقط ہوجانے کا موجب نہیں ہے۔ اور اجرائے حدود اور احکامِ شرع لازم کردیتا ہے کہ خصوصیت کو رفع اور زیادتی کا انکار کیا جائے۔ (یعنی ان باتوں کے سامنے خصوصیت اور بڑائی و بزرگی کی کوئی حقیقت نہیں) نہ یہ کہ جس کسی پر حقوقِ شرع میں سے کوئی حق یا اس کی حدود میں سے کوئی حد لازم آتی ہے۔ اس پر حق کا اثبات اور اس پر حد قائم رہنا ضروری ہوجاتا ہے۔ لیکن ضبط اور اعتدال کی رعایت کی شرط کے ساتھ مبالغہ اور افراط سے احتراز و اجتناب اور حرمتِ ایمانیہ اور عزتِ اسلام کی حد سے تجاوز اور اس کا انتساب اللہ تعالیٰ کے حضور سے اور احتیاط اور اقامتِ حد میں خود کی پوری طرح حفاظت، اس وجہ سے کہ ان باتوں کے لئے فرمایا اور حکم دیا گیا ہے کہ یہ امور صاحب شریعت کی نیابت میں بغیر کسی زیادتی یا کمی اور افراط و تفریط کے ہونے چاہئیں (ضروری ہے)۔ اور بعض لوگ جو اقامتِ حدود اور اجرائے احکام میں حد اعتدال سے تجاوز کرتے اور بڑھ جاتے ہیں۔ اہلِ خصوص اور اربابِ کمال سے جن کا تعلق جنابِ حق سے ہے اور جو درگاہِ الٰہی کے مقربین میں سے ہیں وہ نقصان پہنچانے والے ہوتے ہیں۔ اس حیثیت سے کہ اس کے بعد تلافی اور علاج ممکن نہیں ہوتا۔ اور یہ نقصان اس لئے نہیں ہوتا کہ وہ حق کو قائم کرتے ہیں بلکہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ حق سے تجاوز اور معصیت کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اقامتِ حد مرتبۂ خصوص اور رتبۂ ولایت کے منافی نہیں ہے تاوقتیکہ فسق اور ضد اور اپنی بات پر اڑے رہنے کی حد تک نہ ہو: لَا تَلْعَنْهُ فَإِنَّهُ يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ (یعنی: اس پر لعنت مت کرو کیونکہ اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کرتے ہیں)۔ ——— اسی وجہ سے حضرت شیخ شبلیؒ نے

حلاجؒ کے قتل کا فتویٰ دے دیا تھا اور جریریؒ نے اس کے یعنی حلاج قدس سرہ کے مارنے اور قید کو طول دینے کا حکم دیا تھا۔ (حلاج) نے کہا کہ "مسلمانوں کے لئے کوئی کام اس کے قتل سے زیادہ اہم اور مصلحت سے نزدیک تر نہیں ہے تاکہ دین کی نصیحت کا حق اور اس کے دائرہ کی پاکی و پاکیزگی زندیقوں اور ملحدوں کے دعووں سے محفوظ رہیں۔ اس لئے نہیں کہ اُس سے اپنی برتری کا اقرار کرایا جائے اور اس کے قتل میں اعانت کی جائے۔ واللہ اعلم

قاعدہ ۷

انبیاء علیہم السلام کے سوا ہر شخص میں بشری کمزوری ہوتی ہے

کمال مطلق کا اعتقاد کہ جس میں کوئی نقص اور کمی راہ نہ پائے انکار اور تنقیص کو مستلزم ہے یہ خیال کرکے اس میں حرج ہی کیا ہے۔ کسی شخص پر بھی کمال مطلق کا اعتقاد نہیں رکھنا چاہیئے۔ اس لئے کہ آدمی بشریت کے نقص سے خالی نہیں ہوتا اور معصوم ہونا صرف انبیاء کے لئے مخصوص ہے ولایت کی شرط نہیں ہے ایسی خطا اور معصیت کا وجود کہ جس پر نہ اصرار کیا جائے اور نہ مبالغہ مرتب ہو قرب اور درجۂ ولایت کے منافی نہیں ہے۔ سیدالطائفہ حضرت جنید بغدادی

لہ حسین بن منصور حلاج کی کنیت ابوالمغیث تھی۔ طبری نے لکھا ہے کہ منصور کا عرف الحلاج اور کنیت ابومحمد مشہور ہے۔ ایران کے شہر بیضا کا رہنے والا تھا۔ اس کے مسلک و مذہب کے متعلق مختلف اقوال پائے جاتے ہیں۔ بعد والوں نے اس کے عقائد کی حسین توجیہات کی ہیں اور اس کو صاحب سکر اور بحر معرفت کا بناکر اولیاء کبار میں شامل کردیا ہے۔ لیکن اس کے زمانے میں لوگوں نے اسے گمراہ بتایا اور حکومت نے شریعت کی خلاف ورزی کے جرم میں اس پر مقدمہ چلایا۔ علماء نے متفقہ طور پر اس کو گردن زدنی قرار دیا۔ چنانچہ ۲۴ ذی قعدہ ۳۰۹ھ / ۹۲۲ء منگل کے دن اس کو بغداد میں قتل کردیا گیا۔

بہرحال منصور حلاج کے متعلق کافی اختلاف ہے۔ کچھ لوگوں نے اسے گمراہ کہا ہے بعض حضرات نے اولیاء اللہ میں شمار کیا ہے۔ بہت سے ایسے بھی ہیں جنھوں نے خاموشی اختیار کی ہے۔ واللہ اعلم

رضی اللہ عنہ سے لوگوں نے دریافت کیا: هَلْ يَزْنِي الْعَارِفُ ؟ (یعنی: کیا عارف زنا کرتا ہے؟) آپ تھوڑی دیر سر لٹکائے بیٹھے رہے، اس کے بعد سر اٹھایا اور فرمایا: وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا (یعنی: اللہ تعالیٰ کے جتنے کام ہیں ایک امر تقدیری ہیں) یعنی اگر سابقہ ازل اور تقدیر الٰہی اسی طرح ہوئی ہے کہ اس سے یہ گناہ سرزد ہو تو اس کے لئے کیا چارہ کار ہے۔ صرف یہی ہے کہ توبہ اور انابت کے ذریعہ اس سے رجوع کیا جائے۔ بندہ کی ہلاکت، خطا و معصیت میں نہیں ہے بلکہ توبہ اور رجوع کے ترک میں ہے چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام اور شیطان کے حالات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ اور شیخ ابن عطاء اللہ[1] اسکندری صاحب کتاب الحکم قدس سرہ فرماتے ہیں کہ اگر لوگ سوال کریں کہ أَتَتَعَلَّقُ هِمَّةُ الْعَارِفِ بِغَيْرِ اللّٰهِ (یعنی: کیا عارف اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور سے تعلق رکھتا ہے؟)۔ انھوں نے جواب دیا "کوئی تعلق نہیں رکھتا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی معرفت ولایت کے منافی اور متناقض ہے۔ اگر توجہ کسی غیر حق کی طرف ہو جائے تو معرفت نہیں ہوگی نہ وہ شخص عارف رہے گا۔ واللہ اعلم

قاعدہ ۹۷

کیا فتنہ کے خوف سے ارتکاب جرم کر سکتا ہے؟

ایسی مکروہ و مباح چیزوں کے دور کرنے کی غرض سے جن میں فتنہ کا خوف اور آفت کا گمان ہو، ارتکاب جرم کرنا جب تک کہ ان کے واقع ہونے کا پورا یقین نہ ہو جائز نہیں ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص اس خیال سے

---

[1] احمد بن محمد بن عبدالکریم بن عطاء اللہ الاسکندری الجذامی الشاذلی معروف بہ ابن عطاء اللہ اسکندری علوم ظاہری و باطنی میں درجۂ کمال پر فائز تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، نحو اور اصول میں کافی درک تھا۔ طریقۂ شاذلیہ میں منسلک تھے۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ سے مخالفت تھی۔ ماہ جمادی الاخریٰ ۷۰۹ھ / ۱۳۰۹ء میں قاہرہ میں انتقال ہوا۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

کہ گمنامی کی زندگی بسر کرے اور لوگوں کی نظروں میں خود کو گرا دے اور غیر شرعی باتیں اور کھیل کود اختیار کرے تو اگر اس (فعل) کی حرمت علماء کے نزدیک متفق علیہ ہے تو یہ جائز نہیں ہوگا۔ اور اگر مختلف فیہ ہے تو صحیح ہے اور اس میں چنداں حرج اور دشواری نہیں۔ اور اگر اہل تجرید و معرفت کے نزدیک کسی بہتر مصلحت اور غرض کی بنا پر ہو تو اس میں جواز کی صورت نکلتی ہے۔ اس میں بھی دو شرطیں ہیں ایک یہ کہ راجح کے خلاف اور اس شخص کے مذہب کے فتوے کے جن کی تقلید اور جن کا اتباع کیا جا رہا ہے برعکس نہ پڑے۔ دوسری شرط یہ کہ دونوں طرف قوی اختلاف ہو۔ صرف قول غریب اور مذہب ضعیف کے مطابق عمل نہ کیا جاتا ہو۔ اس موقع پر وہ صوفیہ جو غلو سے کام لیتے ہیں اپنی جگہ سے ہٹ جاتے ہیں۔ اور اس مصلحت پر کہ جو نفس کے خلاف سوچی ہے تھوڑی بات پر ہی قناعت کر لیتے ہیں اور ان حکایتوں سے جو ارباب احوال کی منقول ہوئی ہیں تمسک کرتے ہیں۔ لیکن محقق اس سے منع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حمام کے چور کے قصہ کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں کہ اس مرد عارف نے چوری کی جو شرع شریف میں بالاتفاق فعل حرام ہے یہاں تک کہ لوگوں کی نظر سے گر گیا اور خلق کی بھیڑ بھاڑ اور عوام کے ہجوم سے چھٹکارہ پا گیا اور حمام کے چور کا قصہ یہ ہے کہ مشائخ میں سے کوئی ایک شیخ جو اپنے زہد و صلاح کی وجہ سے مشہور اور اپنے زمانے کے لوگوں کا مرجع تھے۔ جب انھوں نے اپنی جانب خلق کو اس قدر رجوع کرتے اور اتنی تعظیم و تکریم کرتے دیکھا تو ان کو اپنے سر سے ہٹانا چاہا۔ انھوں نے ایک حیلہ سے کام لیا تاکہ لوگ ان کے گرد نہ آئیں (وہ یہ کہ) ایک حمام میں پہنچے اور وہاں سے ایک شخص کے کپڑے اٹھائے انھیں پہنا اور راستہ پہ آکر کھڑے ہو گئے۔ جس شخص کے کپڑے تھے جب وہ حمام سے باہر آیا اور اپنے کپڑوں کو تلاش کرنے لگا (آخر اپنے) کپڑے ان صاحب کو پہنے ہوئے دیکھا تو اسی وقت پکڑ لیا اور (خوب) مارا اور توہین کی یہاں تک کہ شہر کے تمام لوگوں کے کانوں تک یہ بات پہنچی کہ شیخ نے چوری کی ہے، سب کا اعتقاد ان پر سے جاتا رہا اور دوسری مرتبہ پھر کوئی ان کے پاس نہ آیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کپڑوں کا اٹھا لے جانا اور ان کو پہن لینا نہ اس قسم کا

سرقہ ہے جو شرع میں بالاتفاق حرام ہے اور حد کا مستوجب ہے حقیقت میں سرقہ یہ ہے کہ حفاظت کی جگہ پر رکھے ہوئے مال کو خفیہ طریقہ پر اٹھایا جائے اور حمام حفاظت کی جگہ ہیں داخل نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ بغیر اجازت دوسرے کے مال میں تصرف کیا گیا۔ اس لئے کہ کپڑوں یا اسی قسم کی دوسری چیزوں میں مسامحت بہت چلتی ہے۔ اگر کوئی شخص مسلمانوں کے کپڑے کسی اعتقاد یا مسامحت یا حسن خلق پر اعتماد کے سبب اٹھالے اور پہن لے تو کیا ظلم ہوتا ہے۔ یہ ضرور ہے اگر اجازت لے لے تو مناسب ہے (تاہم جس طرح بھی ہو) فعل مکروہ ہوگا اس کو حرام نہیں کہا جائے گا۔

پھر آپ اس بارے میں کیا کہیں گے کہ حضرت بایزید بسطامی[1] قدس سرہٗ کا ایک مرید ان کی خدمت میں آیا اور اس نے راستہ کی تکلیف اور اپنے کام کی مشکلات کی شکایت کی۔ آپ نے فرمایا "کام آسان ہے۔ اگر تو ایک درہم خرچ کردے تو ابھی مقصد حاصل کرلے۔ اخروٹ خرید۔ ان کو ایک توبرے میں ڈال اور توبرے کو اپنی گردن میں لٹکا۔ ڈاڑھی کو مونڈ ڈال اور اکابر و معارف کے پاس اور ان مقامات پر جا جہاں تیرے معتقد رہتے ہیں۔ لڑکوں کو جمع کر اور ان سے کہہ کہ جو لڑکا میری گردن پر ایک تھپڑ مارے گا اس کو ایک اخروٹ دوں گا۔ اگر تو یہ کام کر گذرا تو راستہ کی آفات سے چھوٹ جائے گا اور اپنے مقصد پر پہنچ جائے گا۔" مرید نے کہا: "سبحان اللہ۔ کیا میری طرح کا کوئی آدمی ایسا کام کرتا ہے؟" فرمایا "یہ سبحان اللہ جو تونے کہا ہے تیرے

---

[1] آپ کا نام طیفور بن عیسیٰ بن آدم بن سروشان اور لقب سلطان العارفین ہے۔ آپ کے دادا پہلے آتش پرست تھے پھر دائرہ اسلام میں داخل ہوگئے۔ حضرت بایزید کا وطن بسطام تھا اسی کی نسبت سے بسطامی مشہور ہوئے۔ آپ نے فیض روحانی حضرت جعفر صادق، ابوحفص، یحیٰی بن معاذ اور شفیق بلخی وغیرہم سے حاصل کیا۔ بعد میں خود ایک طریقہ کے بانی ہوئے۔ یہ طریقہ طیفوریہ کہلاتا ہے۔ تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ نے سنہ وفات ۲۳۴ھ / ۸۴۹ء بتایا ہے۔

تنزیہ اور تقدیس کے لئے تھا۔ نہ ذکر و تسبیحِ حق کے لئے لہٰذا یہاں سے چل دے کہ تیرا اس درگاہ میں کوئی کام نہیں۔"

جواب یہ ہے کہ حضرت سلطان بایزید بسطامی قدس سرہ کی یہ بات حقیقتِ امر میں نہیں تھی اور نہ واقع ہوئی۔ بلکہ صرف اس شخص کے امتحان اختیار اور حالت کی آزمائش کے لئے تھی کہ کس حد تک وہ شخص اپنے اوپر اعتماد رکھتا ہے لیکن اس کی کیا صورت ہوتی ہے کہ جو اس فعل کے لئے حکم دیتے ہیں اور اس کو عمل میں بھی لے آتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ تمام علمائے شریعت اس بات پر متفق ہیں کہ اگر کسی شخص کے حلق میں لقمہ اٹک جائے اور پانی موجود نہ ہو اور قریب المرگ ہو کر ہلاک ہو جائے تو مناسب ہے کہ شراب کا گھونٹ اس غرض سے پی جائے کہ وہ لقمہ حلق سے اتر جائے اور یہ اس وقت ہے کہ شراب کی حرمت پر سب کا اتفاق ہے۔ اور جہاں یہ ہے کہ حیاتِ دنیوی کو جو فنا ہونے والی ہے محفوظ رکھنے کے سبب بھی حرام چیز جائز ہو جاتی ہے تو پھر طاعت میں خلوص پیدا کرنے اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی غرض سے جبکہ یہ حیات ابدی کا بھی سبب ہے کیوں درست نہ ہوگا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ غصّ لقمہ (لقمہ کو دانت سے کاٹنے) کے اس مسئلہ پر قیاس درست نہیں ہے کیونکہ یہاں شراب کے گھونٹ کو ترک کرنے سے زندگی کی جڑ کٹ جاتی ہے کہ جس پر وجود و بقا کا دار و مدار ہے اور تمام کمالات کی تحصیل بھی اسی پر موقوف ہے۔ اعانت قتلِ نفس ایک ایسی چیز ہے جو شرع میں بالاتفاق حرام ہے۔ اور جاہ اور شہرت شرعی طور پر حرام نہیں۔ اس کے وجود سے کمال کی زیادتی ہوتی ہے۔ یہ بھی اس فعل سے متیقن نہیں ہے اور وہ افعال و حرکات جو ملامتیہ فرقہ کے محققین کرتے ہیں دوسرے ہیں۔ وہاں شرعی طور پر حرام اور مکروہ چیزوں کا ارتکاب نہیں ہے۔

اس کا خلاصہ تو صرف یہ ہے کہ عبادات کو چھپایا جائے اور بعض ایسی عادتوں کا اظہار ہو جو ظاہر میں عیب معلوم ہوتی ہوں اور حقیقتِ حال پر مطلع ہونے سے پہلے نامشروعات ظاہر ہوں کیونکہ ملامتیہ فرقہ کا مقصد اور ان کی نیت نفس سے فرار اور اس

کی نگہداشت ہے، نہ کہ حال کو خلق سے چھپانا، اور اخفا کا قصد خلق کی نظر میں ان کی تعظیم معلوم ہوتا ہے۔ پھر وہی بات لازم آئی کہ اس سے دور رہا جائے اور حقیقت میں اس حال کا حصول خصوصاً اس صوفی کے لئے ہے جو اصطلاح مشہور میں فرقہ ملامتیہ میں اکمل واتم ہے اور اس کی نظر خلق سے پوری طرح ہٹ جاتی ہے۔ فعلاً بھی ترکاً بھی وجوداً بھی اور عدماً بھی۔ چنانچہ ابوالعباس[1] المرسی رضی اللہ عنہ نے کہا: مَنْ اَرَادَ الظُّهُوْرَ فَهُوَ عَبْدُ الظُّهُوْرِ وَمَنْ اَرَادَ الْخِفَاءَ فَهُوَ عَبْدُ الْخِفَاءِ وَعَبْدُ اللّٰهِ سَوَاءٌ عَلَيْهِ اَظْهَرَهُ اَوْ اَخْفٰى (یعنی: جس کسی نے ظہور کا ارادہ کیا وہ بندۂ ظہور ہے اور جس نے خفا کا قصد کیا وہ بندۂ خفا ہے۔ لیکن خدا کا بندہ وہ ہے جس کے لئے ظہور اور اخفا دونوں برابر ہیں)۔ واللہ اعلم

قاعدہ ۱۰۷

مقصودِ اصلی حق کی موافقت ہے

اصل مقصود تو حق کی موافقت ہے نفس کی مخالفت نہیں۔ اگر نفس حق کے ساتھ موافقت کرتا ہے تو وہ شریعت کا تابع ہوتا ہے اور اس لئے اتم واکمل ہے: حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ (یہاں تک کہ اس کی ہوائے نفس تابع ہو جائے اس چیز کی جو میں اس کے لئے (دین وشریعت کے اعتبار سے) لایا ہوں)۔ اسی کی طرف اشارہ ہے قَالَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيْزِ اِذَا وَافَقَ الْهَوَى الْحَقَّ فَذٰلِكَ تَشْبِيْهٌ بِالزُّبْدِ (یعنی: حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا: جب نفس نے حق کے ساتھ موافقت کرلی تو اس میں وہ لذت پیدا ہوگئی جو مسکہ میں شہد کے مل جانے سے اور دودھ میں شکر کے گھل جانے سے ہوتی ہے)۔ کہ وہ

---

[1] پورا نام احمد بن محمد الصناجی الاندلسی ہے۔ اندلس کے شہر مرسیہ کی نسبت سے شیخ ابوالعباس المرسی کہلاتے ہیں۔ باپ کا نام عریف تھا۔ ابوالعباس ظاہری اور باطنی علوم کے جامع تھے۔ مریدوں اور معتقدوں کی تعداد بہت تھی۔ ۵۳۶ھ/۱۱۴۲ء میں مراکش میں آپ کا انتقال ہوا۔

ایک دوسرے سے گھل مل جاتے ہیں ـــــ مثلاً اگر کسی شخص کو اس کے ماں باپ حلوا کھانے کا حکم دیں اور جو کی روٹی کھانے سے منع کریں، تو اس کے لئے یہ حلوا کھانا اور اس سے لذت حاصل کرنا زیادہ بہتر اور نفع بخش ہوگا جو کی روٹی کھانے اور ترکِ لذت کرنے سے۔

ایک دوسرا گروہ نفس کی مخالفت کرتا اور اس کے خلاف کرنے میں اتنا مبالغہ کرتا اور ایسا اغراق دکھاتا ہے کہ ان پیچیدگیوں کے سبب حق کی مخالفت ہونے لگتی ہے۔ متعدد طاعات وعبادات کے فوت ہونے کا سبب پیدا ہو جاتا ہے اور بعض وہ سنن و نوافل بھی کہ نفس کو جن سے لگاؤ اور جن کی عادت ہو جاتی ہے ترک ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ یہ بھی نفس کے علاج کے باب میں نافع ہے اور اس کا اثر ہوتا ہے۔ تاہم اس طریق کا سلوک تمام جد وجہد کو باطل کر دیتا ہے اور اس طریق پر چلنے والے کو مقصود کی مخالف راہ پر لے جاتا ہے۔

مشائخ شاذلیہ[1] کا طریق یہ ہے کہ وہ طالبوں کی ہدایت اور مریدوں کی تربیت ان کی طبیعت کے موافق اور ان کے رفق وراحت کا خیال رکھتے ہوئے کرتے ہیں اور فوری طور پر ان کی پہلی حالت سے زور زبردستی کر کے نہیں نکالتے۔ نیز مجاہدہ اور ریاضت میں ان پر کسی قسم کی سختی نہیں برتتے۔ بلکہ ان اوراد و اشغال سے جو طالب کے نرم طبیعت اور مزاج کے موافق ہوں راہ دکھاتے اور مشغول رکھتے ہیں۔ اور مہربانی اور آرام اور رفتہ رفتہ مزید آسانی کے ساتھ منزلِ مقصود پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جو کوئی اس راہ میں اپنا سفر طبیعت کے موافق اور اپنے مرغوب طریقے سے کرتا ہے، درگاہِ حق تک اس کی رسائی سب سے زیادہ آسان اور سب سے زیادہ قریب ہو جاتی ہے، اور جو کوئی حرکت طبیعی کے خلاف چلتا ہے اس کے فاصلہ کے اندازہ میں طبیعت سے ناموافقت کی وجہ سے اس کی سیر زیادہ آہستہ اور اس کی رسائی دشوار ہو جاتی ہے۔

شیخ ابن عطاء اللہ اسکندری صاحب کتاب الحکم تاج العروس میں کہتے ہیں:

---

[1] یہ تصوف کا ایک سلسلہ ہے جس کی نسبت یمن کے مشہور بزرگ حضرت شیخ ابو الحسن شاذلی سے ہے۔

لَا تَأْخُذَ مِنَ الْاَذْكَارِ اِلَّا مَا يُعِيْنُكَ الْقُوَّى النَّفْسَانِيَّةُ عَلَيْهِ بِمَحَبَّتِهٖ (یعنی: کوئی ذکر اختیار نہ کر سوائے اس ذکر کے جس میں نفسانی قوتیں خدا کی محبت میں تیری مدد کریں)۔

اور قطب وقت شیخ ابو الحسن شاذلیؒ[1] جو شاذلیہ سلسلہ کے امام اور منتہا ہیں، فرماتے ہیں: اَلشَّيْخُ مَنْ دَلَّكَ عَلٰى رَاحَتِكَ (یعنی: شیخ وہ ہے جو تیری راحت کی جانب تیری رہنمائی کرے) (یعنی تجھے مجاہدہ اور ریاضت کا حکم نہ کرے) اور اس حدیث کے معنی کے بیان میں کہ يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا (یعنی: آسان کرو دشوار نہ بناؤ)۔ فرمایا ہے یعنی دُلُّوْهُمْ عَلَى اللّٰهِ وَلَا تَدُلُّوْهُمْ عَلٰى غَيْرِهٖ فَاِنَّ مَنْ دَلَّكَ عَلَى الدُّنْيَا فَقَدْ غَشَّكَ وَمَنْ دَلَّكَ عَلَى الْعَمَلِ فَقَدْ اَتْعَبَكَ وَمَنْ دَلَّكَ عَلَى اللّٰهِ فَقَدْ نَصَحَكَ (یعنی: جس کسی نے تیری رہنمائی دنیا کی طرف کی اس نے تیرے حق میں خیانت کی اور جس کسی نے تجھ کو مجاہدہ اور ریاضت کی شدت میں پھنسایا تو تجھے سختی اور تکلیف میں مبتلا کیا۔ اور جس کسی نے تجھے خدا کا راستہ دکھایا وہی حقیقت میں تیرا ناصح اور خیر خواہ ہے)۔ واللہ اعلم

قاعدہ ۱۷

جس طرح لفظ میں معنی کی رعایت لازم ہے اور لفظ کا قالب معنی کی روح کے بغیر صحیح اور معتبر نہیں ہوتا۔	**الفاظ کی نگہبانی اور معانی کا ضبط دونوں ضروری ہیں**

اسی طرح لفظ میں ایسی رعایتیں ہونا ضروری ہیں جو معنی کو سننے والے کے ذہن میں

---

[1] اصل نام علی بن عبداللہ ہے۔ سلسلہ نسب حضرت حسین بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ملتا ہے۔ آپ کا قیام ایک طویل عرصہ تک شہر اسکندریہ میں رہا۔ وہاں بے شمار لوگ آپ سے رجوع کرتے تھے۔ آپ اولیائے عظام اور مشائخ کبار میں سے ہیں۔ دعائے حزب البحر جو اولیاء اللہ میں بے حد مقبول رہی ہے، آپ ہی سے منسوب ہے۔ ۶۵۶ھ ۱۲۵۸ء میں یمن میں وصال ہوا۔ مزار یمن کے شہر مخا میں ہے جو اپنی قہوہ کی پیداوار کے لئے مشہور ہے۔

اتار دیں اور اس کے فہم پر اس کی وضاحت اور اظہار کر دیں۔ پہلے معنی کی صحت اور دل میں اس کا ربط وضبط تلاش کرنا چاہیئے اس کے بعد زبان کی نگہبانی اور اس کی ادائیگی میں اس کی حفاظت کرنی چاہیئے تاکہ بیان مقصود لفظاً اور معناً تمام ہو جائے اور اشکال و ابہام سے خالی رہے۔ کیونکہ معنی کے ضبط کے بغیر گمراہی لازم آتی ہے اور لفظ کی نگہبانی کے بغیر بے راہ روی ضروری ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ محققین کامل اس وجہ سے کہ لفظ اور عبارت میں نقص ہے معنی مقصود کی ادائیگی اور حقیقت کے بیان میں ایہام و اشتباہ کی وجہ سلیم کے چکر میں پڑ جاتا ہے۔ اور ظاہر بیں اور عبارت پرستوں کے نزدیک کفر، بدعت، فسق کے ساتھ منسوب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جو کچھ خصوصیت سے اس گروہ کو بالخصوص ان کے متاخرین کو پیش آیا اس میں سے اکثر اسی قبیل کا ہوگا۔ کبھی عام رہ گذر سے اشخاص اور واقعات کا ضرر بھی لازم آتا ہے یہاں تک کہ ایک شخص سے اسی کے معنی معتبر و مقبول قرار پاتے ہیں اور دوسرا ان کو منکر و مردود قرار دیتا ہے۔ اور یہ بھی ہوتا ہے کہ لفظ اور معنی کے اتحاد کے باوجود ایک ہی شخص سے ایک وقت میں مستحسن اور دوسرے وقت میں مردود ہو جاتے ہیں۔ جس طرح متکلم کے حال کے بدل جانے سے حکم میں اختلاف ہو جاتا ہے اسی طرح سامع کا حال ہے: حَدِّثُوا النَّاسَ بِمَا يَعْرِفُونَ أَتُرِيدُونَ أَنْ يُكَذَّبَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ (یعنی: لوگوں سے اس انداز کے ساتھ بات کرو جس کو وہ پہچانتے ہیں۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ وہ اللہ اور رسولؐ کو جھٹلائیں۔

حضرت جنید قدس سرہ کے بارے میں روایت ہے کہ کچھ لوگ آپ کے پاس آئے اور انھوں نے آپ سے ایک مسئلہ پوچھا۔ آپ نے ہر ایک کو جواب مختلف دیا۔ لوگوں نے دریافت کیا، یہ کیا بات ہے آخر ایک مسئلہ کا حکم تو ایک ہی ہے، فرمایا: اَلْجَوَابُ عَلٰی قَدْرِ السَّائِلِ (یعنی: جواب سائل کے فہم کے مطابق ہوتا ہے) جیسا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اُمِرْنَا اَنْ نُكَلِّمَ النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُولِهِمْ (یعنی: ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق بات کرو) واللہ اعلم

قاعدہ ۱۲۷

ہر بات کتاب و سنت کی روشنی میں کی جائے

حقیقت کو پرکھنے کے سلسلہ میں نظر کو کوتاہ کر لینا طریقت کی اصلیت کو سمجھنے میں مخل ہوتا ہے اور اسی سبب سے واضح شریعت کی روشنی میں ایک گروہ کے طامات اور شطحیات پر اعتراض وارد کرنے کا موجب اور ان کے انکار کا سبب ہوتا ہے۔ پس قول میں احتیاط واجب ہے تاکہ کتاب و سنت کے علاوہ کسی جگہ سے کوئی بات نہ لیں اور الفاظ میں تحفظ کریں تاکہ بیان مقصود غیر واضح اور مبہم نہ رہے سوائے منکر کے کہ اصل میں مستند ہے اور جس کی وجہ واضح ہے وہاں تو مجبوری ہے اور اس لئے عتاب اور ملامت کا محل نہیں۔

ابو سلیمان دارانی[1] رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی گروہ کے کلام سے کوئی نکتہ میرے دل میں جاگزیں ہوتا ہے۔ اور ایک مدت تک میں اسی پر غور کرتا رہتا ہوں۔ ہرچند کہ وہ نکتہ اپنے حسن و لطافت کے اقتضاے زبانِ حال سے فریاد کرتا رہتا ہے کہ مجھے قبول کر۔ لیکن میں اسے قبول نہیں کرتا سوائے اس کے جس پر قرآن و سنت شاہد ہوتے ہیں۔ ہر صوفی خلق کے ساتھ حقیقت بیان کرنے پر مامور و مشروع نہیں ہوتا اور توجیہ صرف حقیقت کو جانچنے میں ظاہر کرتا ہے اور ملاحظہ اور اعتبار کی نظر سنت و شریعت الٰہی پر جو اس نے اپنے بندوں کے لئے بنائے ہیں اور جن کا حکم فرمایا ہے، نہیں پڑتی۔ البتہ

---

[1] آپ کا نام عبدالرحمٰن اور والد بزرگوار احمد بن عطیہ تھے۔ دمشق کے نواحی دیہات میں ایک قریہ دارا ہے اسی کی نسبت سے آپ دارانی کہلاتے ہیں۔ شام کے مشائخ متقدمین میں آپ کا شمار ہے۔ زہد و تقویٰ میں یکتا اور پیشوا سمجھے جاتے تھے۔ آپ سے کسی نے معرفت کی حقیقت پوچھی تو آپ نے نہایت مختصر الفاظ میں جواب دیا کہ "معرفت یہ ہے کہ بجز ایک کے دل میں کسی دوسرے کی طلب نہ ہو۔" وفات ۲۱۵ھ / ۸۳۰ء میں اور مزار موضع دارا میں ہے۔

اعمال یا شطح در احوال یا ابہام اور اشکال و اقوال میں غلط راہ پانے سے محفوظ نہیں رہتی اور اس طرح یہ خود ہلاک ہو جاتی ہے یا دوسروں کو ہلاک کر دیتی ہے یا دونوں کا یہی انجام ہوتا ہے قَالَ بَعْضُ الْعَارِفِیْنَ مَنْ عَامَلَ الْحَقَّ بِالْحَقِیْقَۃِ وَالْخَلْقَ بِالشَّرِیْعَۃِ فَھُوَ صِدِّیْقٌ وَمَنْ عَامَلَ الْحَقَّ بِالشَّرِیْعَۃِ وَالْخَلْقَ بِالْحَقِیْقَۃِ فَھُوَ زِنْدِیْقٌ وَمَنْ عَامَلَ الْحَقَّ بِالشَّرِیْعَۃِ وَالْخَلْقَ بِالشَّرِیْعَۃِ فَھُوَ مُؤْمِنٌ سُنِّیٌّ۔ (یعنی: بعض عارفوں نے کہا جس نے خدا کے ساتھ معاملہ حقیقت کی روشنی میں کیا اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ شریعت کی روشنی میں وہ صدیق ہے۔ اور جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریعت کا اور مخلوق کے ساتھ حقیقت کا معاملہ کیا وہ زندیق ہے اور جس نے معاملہ خدا کے ساتھ شریعت کا اور مخلوق کے ساتھ شریعت کا کیا وہ مومن سُنّی ہے)۔ واللہ اعلم

قاعدہ ۱۳۷

اشتباہ کے موقع پر توقف مناسب ہے

ایسے اشکال اور اشتباہ کے موقع پر توقف کرنا کہ جہاں دلیل یقینی نہ ہو محمود ہے۔ اور مقامِ یقین کہ جہاں دلیل قاطع اور واضح ہے مذموم۔ اس طریقے کے مبنی اور مدار حسن ظن اور اس کی ترجیح ان چند دلیلوں پہ ہے جو اس کے پاس اس دلیل کی مخالف و معارض ہیں۔ یہاں تک کہ کہا گیا ہے کہ ہزار کافروں کا اسلام کے شبہ میں کفر سے خارج ہو جانا صحیح ہے نہ ایک مومن کا کفر کے شبہ میں ایمان سے خارج ہو جانا۔ درحقیقت اہلِ قبلہ کی عدم تکفیر کی بنیاد بھی اسی نکتہ پر ہے۔ ایک اور گروہ اس طرف گیا ہے کہ جزم جو اجتہاد کا مودای اور دلیل ظاہر کا مقتضیٰ ہے قبول اور انکار سے واجب اور لازم ہے۔ کام کی غرض و غایت امر الٰہی سے باطن کے کام کی تفویض ہے اور اسی سے صوفیہ کی جماعت میں ہر دم اختلاف رونما ہوتا ہے کیونکہ ان صوفیہ سے مشتبہات اور وہم فعلاً اور قولاً ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک فرقہ انکار کے راستہ پر جاتا ہے اور دوسرا گروہ مقام توقف اختیار کرتا ہے اور حقیقت اور انصاف کی نظر میں دونوں گروہ اس مقتضا کے سبب جو ان کو دکھائی دیتا یا ظاہر ہوتا ہے صحیح ہیں۔

مشائخ طریقت میں سے کسی سے لوگوں نے پوچھا "ابن عربیؒ کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟" یعنی شیخ محی الدین ابن عربیؒ کے بارے میں کچھ لوگوں کے درمیان نزاع اور اختلاف ہے آپ کا کیا خیال ہے اور آپ کیا اعتقاد رکھتے ہیں؟" انھوں نے جواب دیا: هُوَ اَعْرَفُ بِكُلِّ فَنٍّ مِنْ اَهْلِ كُلِّ فَنٍّ (وہ ہر علم میں ہر علم و فن کے آدمیوں سے زیادہ عالم اور زیادہ ماہر تھے)۔ لوگوں نے کہا "ہم آپ سے اس باب میں نہیں پوچھتے کہ ان کو کس قدر علم و مہارت اور برتری تھی۔ سوال ان کے اعتقاد اور انکار کے بارے میں ہے یعنی ایمان، اتباع اور ہدایت کے بارے میں۔" فرمایا: اُخْتُلِفَ فِيْهِ مِنَ الْكُفْرِ اِلَى الْقُطْبَانِيَّةِ۔ (اگر آپ اس بارے میں پوچھتے ہیں تو ان کے متعلق لوگوں کے درمیان اختلاف ہے جو کفر سے شروع ہو کر قطبیت کی حد تک پہنچتا ہے۔ ایک جماعت ایسی ہے جو انھیں کافر سمجھتی ہے دوسری ان کو قطب گردانتی ہے۔) لوگوں نے کہا "پھر آپ کس طرف ہیں اور آپ کے نزدیک کونسی بات واضح ہے۔" فرمایا "اَسْلِمْ تَسْلَمْ" (اسلام اختیار کرو سلامت رہوگے) میرا مذہب تسلیم ہے اور سلامتی تسلیم کے اختیار اور غلو کے ترک کرنے میں ہے۔ اور زیادتی انکار کرنے یا حد سے زیادہ اعتقاد رکھنے میں۔ اس لئے کہ تکفیر میں سراسر خطرہ ہے اور تعظیم میں مبالغہ بھی اپنے اندر ضرر کا احتمال رکھتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ عوام الناس ان کی ان مبہم و موہوم باتوں کا اتباع کرنے لگیں۔ اور مقصد کے کنہ و حقیقت سے عدم واقفیت کی بنا پر کسی دوسری ہی راہ پر جا پڑیں۔ واللہ اعلم

قاعدہ ۱۴

پانچ چیزیں جن چیزوں کو حاصل کیا جائے وہ پانچ ہیں۔ اوّل چیز ان کے علوئے مرتبہ، رفعتِ شان، صفوتِ حال اور ملاحظۂ کمال پہ نظر رکھنا کہ جب رخصت سے تعلق قائم کریں یا آداب میں سے کسی ادب میں محتاجی دکھائیں، یا امور دین میں سے کسی امر میں سہل انکاری سے کام لیں یا صفاتِ نقص میں سے کسی صفت سے متصف ہوں تو اعتراض کرنا ضروری اور انکار کرنا لازمی

ہوتا ہے۔ جو چیز جتنی زیادہ لطیف اور پاکیزہ ہوتی ہے اتنا ہی زیادہ اس کا عیب اور نقص واضح ہوتا ہے۔ چنانچہ سفید کپڑے میں اگر ایک سیاہ نقطہ پڑ جائے تو وہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس قسم کی باتوں کے دفع کرنے کے دو طریقے ہیں۔ اول یہ بات سمجھ لیں کہ کسی شخص میں بھی خالص کمال ثابت نہیں ہے اور کوئی شخص بھی بشریت کے نقص سے خالی نہیں، عصمت صرف انبیاء کے ساتھ مخصوص ہے اور لغزش بلکہ خطا اور گناہ جس میں اصرار اور ہمیشگی نہ ہو کمال کے مرتبہ اور ولایت کے درجہ کے منافی نہیں ہے چنانچہ پچھلے قاعدوں میں اس پر گفتگو کی جا چکی ہے۔

دوم یہ کہ اس گروہ پر اعتراض و انکار کے وجوہ ان کے علوم کی دقت اور اشارات کی لطافت ہیں جو ہر شخص کی سمجھ میں جلدی نہیں آتے۔ درحقیقت سب سے زیادہ شریف اور سب سے زیادہ دقیق و لطیف علم تصوف ہے کہ اس کی بنیاد کتاب و سنت ذوق صحیح اور کشفِ صریح پر ہے۔ چنانچہ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ لَوْ کَانَ تَحْتَ اَدِیْمِ السَّمَاءِ عِلْمٌ اَشْرَفَ مِنْ عِلْمِنَا ھٰذَا لَرَحَلْتُ عَلٰی شَرَفِ ھٰذَا الْعِلْمِ۔ یعنی اگر اس نیلگوں آسمان کے نیچے کوئی دوسرا علم اس علم سے زیادہ شریف ہوتا کہ جس میں ہم اپنے ساتھیوں سے گفتگو کرتے ہیں تو ہم اس کے لئے کوشش کرتے اور اس کی طلب میں دوڑتے۔ ہر علم کا یہ وصف ہے کہ وہ طبیعت کی تیزی، عقل کی قوت، افہام و تفہیم اور بحث و مباحثہ کی مدد سے سمجھ میں آ جاتا ہے۔ مگر یہ علم ایسا ہے کہ اس میں فطرت کی سلامتی، مزاج کی درستی فہم کی تیزی کے علاوہ نفس کی ریاضت، باطن کی صفائی اور ماسوی اللہ سے دل کا پوری طرح خالی ہونا بھی شرط ہے۔ پس انکار کا سبب اصل میں فہم کا قصور، استعداد کی کمی، حوصلہ کی تنگی، معرفت کا نہ ہونا اور ایمان کا ضعف ہے۔ پھر بھی منکر اگر تورع، خوف، حذر، یکسوئی اور سلامتی کی راہ چلتا ہے تو اس پر زیادہ الزام عائد نہیں ہوتا۔ تاہم طریقوں میں سے انصاف پر مبنی توقف اور تسلیم کا طریقہ ہے۔

سوم: اسبابِ انکار میں سے ایک یہ بھی ہے کہ تصوف کے مدعیوں کی کثرت ہو گئی ہے۔ اور جھوٹے بناوٹی اور ریاکار اس گروہ میں داخل ہو گئے کہ وہ غرض کے

بندے اور بدلے کے خواہشمند ہیں۔ پس اس یکسانیت کی وجہ سے اگر محققوں میں سے کوئی ایک حق کا دعویٰ کرے تو ظاہر بینوں کی نظر میں وہ جھوٹے مدعیوں کی طرح نظر آتا ہے۔ یہاں ایسی کوئی دلیل اور ثبوت ہونا چاہیئے جو جھوٹے کو سچے سے الگ کر دے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دلیل تو موجود ہوتی ہے لیکن دیکھنے والے میں اتنی قوت نہیں ہوتی کہ وہ اس کو سمجھ سکے۔ لہٰذا اس موقع پر توقف اور تامل بہتر ہے۔

چہارم:۔ عام لوگوں کی گمراہی کا خوف، الحاد کے چکر میں جا پڑنا اور ظاہر شریعت پر اعتبار نہ کرنا جیسا کہ اکثر جاہل اور گمراہ لوگوں کا مشاہدہ ہوا ہے، اور یہ حقیقت میں اس طریقہ کی اصل اور اس علم کے وجود کا انکار نہیں ہے۔ بلکہ ایک مصلحت کی وجہ سے اور حکمت کی بنا پر ہوتا ہے اور یہ قطعاً ایک مختلف چیز ہے۔

پنجم:۔ حق بات کے ماننے، اس کا اعتراف کرنے اور عدل و انصاف کے راستہ پر قائم اور ثابت قدم رہنے میں بخل کو حسبِ مراتب لوگوں کی سرشت میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔ چونکہ صوفیہ کا تعلق اور توجہ حقیقت کی طرف اور اظہارِ حقیقت پر ہے اور اس چیز کے غلبہ کے سبب جملہ اعتبارات باطل ہو جاتے اور مٹ جاتے ہیں اس لئے یقینی ہے کہ اپنی نیک نامی، تسخیرِ قلوب، رجوعِ خلائق اور عزت و غلبہ کی بنا پر ان کی زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی ایک مخصوص شان ہوتی ہے اور ان کو ایک خاص امتیاز نصیب ہوتا ہے۔ یہ بات فقہا اور علمائے ظاہر کو نصیب نہیں ہوتی۔ اس لئے عام لوگوں کے دل میں ان کی طرف سے ایک گونہ جلن، رشک اور حسد پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اہلِ کمال کی تنقیص کرنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے دلوں میں عزت و تعظیم کے لئے کوئی جگہ نہیں رہتی۔ وَذَالِكَ نَفْخَةُ الصُّدُوْرِ (اور یہ سینوں کا ورم کرنا ہوتا ہے)۔ یعنی اس سے لوگوں میں بے اعتقادی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس قسم کا شخص انکار میں معذور ہی نہیں بلکہ محروم اور نقصان اٹھانے والا بھی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس پہلی قسموں کے لوگ معذور بلکہ ماجور ہیں۔ اور حقیقی سبب عباد اور عرفا کی نہ کہ فقہا اور علمائے ظاہر کی اچھی شہرت قائم رہنے اور اچھے الفاظ میں ان کا ذکر ہونے کا یہ ہے کہ تصوف اور تعبد کے غلبہ اور اللہ کی طرف توجہ

سے وہ عاری اور خالی ہوتے ہیں۔ فقیہ اپنے نفس کی صفات میں سے ایک صفت کی طرف منسوب ہوتا ہے اور اسی سے اس کو شغف رہتا ہے۔ وہ صفت اس (فقیہ) کی عقل اور سمجھ ہے اور وہ اس کی حس اور حیاتِ ظاہر کے ختم ہو جانے سے ختم اور نابود ہو جاتی ہے اور عارف اور عابد کی نسبت پروردگار سے جو حیؒ وقیوم ہے ہوتی ہے، اور پروردگار کی صفت یہ ہے کہ وہ ازل سے ابد تک باقی ہے۔ پھر وہ کیسے مر سکتا ہے کہ جس کا تعلق بغیر علت نفس، ذات حی لایموت کے ساتھ ہو گیا ہو ے

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

(یعنی: جس شخص کا دل عشق کی وجہ سے زندہ ہو گیا ہے وہ کبھی نہیں مرتا۔ چنانچہ ہم (عاشقوں) کا دنیا کی کتاب پر ہمیشہ نام باقی رہے گا)۔ اور اسی لئے مجاہد بھی جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں شرفِ شہادت سے سرفراز ہوا ہے اور جب اس نے اللہ تعالیٰ کے کلمہ کی تحقیق اور دین کا اعلان حسّاً و معناً کیا ہے وہ دونوں قسم کی حیات سے کہ جو حسی و معنوی ہیں سرفراز ہو جاتا ہے: وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ

(یعنی: اور ان لوگوں کو جو اللہ کی راہ میں شہید ہوئے ہیں مُردہ مت سمجھو، بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کی طرف رزق پاتے ہیں)۔ اور جب صلحاء کا عمل اور ان کی عبادت کلمۃ اللہ اور دین کی تحقیق اور اعلائے معنوی ہے حیاتِ معنوی کے اور اس پر اقتصار کرنے کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اور وہ دوام اس کی کرامت اور ذکرِ خیر و برکت ہے چنانچہ کہا گیا ہے ع

قَدْ مَاتَ قَوْمٌ وَهُمْ فِي النَّاسِ اَحْيَاءٌ

(یعنی: ایک جماعت مر گئی ہے اگرچہ وہ جماعت مردوں کے درمیان زندہ ہے)۔ واللہ اعلم

قاعدہ ۱۵

صوفیہ کے اقوال سے متعلق کتابوں کے مطالعہ کی شرطیں

جو کتابیں علماء اور فقہاء نے صوفیہ کے اقوال کے ظاہری مفہوم کے رد و انکار میں لکھی ہیں اگرچہ ان کے

غلط مواقع پر استعمال سے ڈرانے، روکنے اور حفاظت کرنے کی غرض سے ہیں اور اگرچہ ان میں نفع کا شائبہ ہے لیکن ساتھ ہی نقصان کا بھی احتمال ہے ان سے حقیقت کا حصول اور نفع اور فائدہ حاصل کرنا چند شرطوں کی رعایت پر موقوف ہے۔ اوّل یہ کہ نظر کو اپنے احوال پر مختصر کر دیجئے (زیادہ نہ جائیے) اور اس کو اپنے نفس پر انکار و مواخذہ کا سبب بنائیے۔ فصاحت اور طلاقت لسانی اور مجلس آرائی کا اظہار نہ کرے اور سالک راہ کے علاوہ کہ جو طبیعت کی ذہانت، عقل کی تیزی اور مزاج کی سلامتی رکھتا ہو اور جانتا ہو کہ کس وقت بات کی جائے۔ مقصد کی کیا نزاکت ہے۔ صدق، تحقیق اور سلوک کے مقام میں ثابت قدم رہے اور ورع اور احتیاط کے طریقوں سے موصوف ہو، کسی سے بیان نہ کرے۔ اور سادہ لوح اور خالی الذہن مریدوں کے جو گہری عقیدت کی بنا پر کہ وہ حضرات مشائخ سے رکھتے ہیں اور بات کو سمجھنے کی قوت نہیں رکھتے درمیان نہ لائے اور جو اعتقاد اور ارتباط ان کو مشائخ سے ہے اس میں انھیں پریشانی اور الجھن (پراگندگی) میں نہ ڈالے اگر بفرض محال وعظ و نصیحت کے موقع پر کسی بات کو جتانے یا تنبیہ کرنے کی ضرورت ہو تو ایک عام بات کے انداز میں دخل دے یا اعتراض کرے۔ قائل کا نام نہ لے اور بیان کے سلسلہ میں اس گروہ کی عظمتِ حال اور جلالتِ شان کا لحاظ کرتے ہوئے اعتراض کرے۔ اس لئے کہ اماموں کی لغزشوں کو چھپانا، بزرگوں کی خطاؤں کو پوشیدہ رکھنا واجباتِ وقت اور اسبابِ سعادت سے ہے۔ اور دین کی نگہبانی مملکتِ اسلام کی حفاظت اور شریعت کی مراعات اس سے زیادہ واجب اور لازم ہیں۔ خدا کے دین پر قائم رہنے والا ماجور اور اس کی مدد کرنے والا منصور ہے۔ حق بات کے سلسلہ میں انصاف لازم اور نفس اور خواہش کی پیروی ممنوع ہے۔ وہ دیانت جو خواہش اور ہوا کی ساتھی ہو فاسد ہے۔ اور وہ نصیحت جس میں نفسانی غرض کی آمیزش ہو باطل ہے۔

دوسری شرط۔ مشائخ کے ساتھ مضبوط اعتقاد اور حسنِ ظن اور ان کے دامنِ عزت و کمال کی طعن اور تنقیص کے غبار سے پاکی و صفائی اور حسنِ ظن کا اظہار اس طریقہ پر کہ جس بات کی تنقیص کی جا رہی ہے اس کی نسبت ان سے ممکن نہیں یا یہ کہ ان سے یہ فعل

صادر نہیں ہو سکتا اور دوسرے ان کے افعال کی اس طرح تاویل کہ یہ کام جس کا ظاہر مخالف ہے درحقیقت مخالف نہیں۔ یا اگر مخالف بھی ہے تو ان سے سکرِ حال اور غلبۂ وجد کی وجہ سے صادر ہو گیا۔

تیسری شرط: اس بات کا اعتقاد کہ رد و انکار کا باعث دراصل مادہ فاسد اور غلط تصورات کی روک تھام ہے تاکہ عام خلقت اور اس راہ پر چلنے والے گمراہ نہ ہوں اور صدق و تمکن حقیقت کے مقام کی تحقیق کے بغیر ان کی تقلید اور پیروی کی راہ پر نہ چلیں کیونکہ تقلید و اتباع شریعت کے ظاہری احکام میں چلتی ہے۔ احوال و مواجید اور اذواق میں نہیں۔ اور فقہاء میں سے جو لوگ صوفیہ کے گروہ کے رد و انکار کی راہ پر چلتے ہیں اور جنھوں نے اس معاملہ میں سختی اور شدت سے کام لیا ہے وہ ابن جوزی ہیں جو فقہ اور حدیث کے بڑے علماء میں سے ہیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ" اس کا بھی مقصد ذرائع کی روک تھام ہے۔ اس کی آرائش و زیبائش کے خیال سے اپنی کتابوں کو مشائخ کی حکایتوں اور کلمات اور ان کے افعال و اقوال سے استشہاد کے ذکر میں ردّ و انکار کے باوجود انھوں نے ان کے بارے میں بعض موقعوں پر اپنی کتاب تلبیس ابلیس میں جو ان کی مشہور تصنیف ہے چند جگہوں پر کیا ہے۔ انھوں نے مبالغہ سے کام لیا ہے اور قسم کھائی ہے کہ میرا مقصد علم کا اظہار اور سنت کی تحقیق اور بدعت کے مواضع پر تنبیہ اور تحذیر (ڈرانا) ہے۔ رجال پر طعن کرنا اور اہلِ کمال کی تنقیص کرنا نہیں۔ لیکن ان کے کلام کی شدت، سختی اور لہجہ کی تیزی سے جو انھوں نے اپنی کتاب میں اختیار کیا ہے ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان کا انکار قوی اور ان کی نزاع معنوی ہے اور انصاف کی نظر میں یہ کتاب شیطان کے داخل ہونے اور بدعت و جہالت کے مادہ کو کاٹ ڈالنے کی معرفت میں بے نظیر ہے۔ قطع نظر اس سے کہ ان کے الفاظ کی سختی، انکار کی شدت اور طعن و تشنیع میں گہرائی وحشت میں مبتلا کرنے اور تشویش میں ڈالنے والا ہے، اس لئے اربابِ نصیحت میں سے محققین نے اس کتاب کے پڑھنے اور اس کی مثالیں دینے سے منع کیا اور روکا ہے، اور وصیت کی ہے کہ اس پر غور و خوض نہ کیا جائے۔ تاکہ مشائخ اور اربابِ احوال سوءِ ظن اور

ان کی تنقیص میں مبتلا نہ ہوں جیسا کہ اس کتاب اور اس میں مذکور مثالوں سے منع کیا ہے۔ اسی طرح اربابِ طریقت کی بعض کتابوں مثلاً فصوص اور اس کے مثل اور کتابوں پر غور کرنے سے بھی روکا ہے کہ ان میں اسرار، حقائق اور مواجید کو صریحاً بغیر توقف اور یکسوئی کے لکھ ڈالا ہے۔

چوتھی شرط جو خلاصۂ کلام اور حاصلِ مقصد ہے یہ ہے کہ اپنے علم کی کمی اور عقل کی کمزوری کا اعتراف کرے۔ خدا جانتا ہے کہ انھوں نے (مشائخ نے) کیا کہا ہے اور کس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان کی باتوں کو انھیں کے ساتھ چھوڑے اور خود کو اپنے تصرف کو درمیان سے ہٹالے۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ توقف اور انکار اس بات پر کیا جاتا ہے جو اس کی سمجھ میں آرہی ہے یا احتمال اس امر کا ہو کہ انھوں نے اس چیز کا قصد کیا ہے جو فی نفسہٖ بری نہیں ہے۔ پس حقیقت میں انکار خود اپنے نفس پر ہوتا ہے ان پر نہیں۔

حاصل کلام یہ کہ شریعت ایک واضح چیز ہے، خود اس کے موافق چل اور اسی کے مطابق کام کر۔ اور اگر تجھ سے مسئلہ شرعی پوچھا جائے تو شریعت کے حکم کے مطابق جواب دے۔ اور اگر صادقانِ راہ کے بارے میں کوئی بات آجائے تو تغافل سے کام لے اور چشم پوشی اختیار کر۔ واضح رہے کہ انکار دوری اور حرمان کا سبب ہوتا ہے اور تصدیق و اعتقاد کامیابی کا موجب ہے وَاللّٰهُ الْهَادِیْ وَمِنْهُ التَّوْفِیْقَ لِنَیْلِ الصَّوَابِ (یعنی: اللہ تعالیٰ ہی ہدایت کرنے والا ہے۔ وہی توفیق دیتا ہے اور وہی صحیح بات تک پہنچاتا ہے)۔

کتاب قواعد الطریقۃ فی الجمع بین الشریعت والحقیقۃ سے قواعد کی نقل پوری ہوئی۔ چونکہ اس کتاب کی عبارتیں وقت کی مناسبت سے بے حد مختصر تھیں۔ اس لئے اگر شرح اور وضاحت کی وجہ سے کسی کلمہ یا فقرہ کی زیادتی ہوگئی ہو تو کچھ بعید نہیں لیکن کسی بات یا حکایت کی نقل میں اُس اصل سے زیادتی نہیں کی گئی جو شیخ کا مقصود یا اُن کا اپنا کلام ہے سوائے بعض جگہوں کے۔ اور اگر توفیق ملی تو اس

مفہوم کو دوسرے رسالوں میں بھی وقت کے تقاضہ کے مطابق کچھ اور مضمون شامل کرکے تفصیلاً دیا جائے گا انشاء اللہ تعالیٰ

خاتمہ | اب اہلِ حق کے اعتقادات کی طرف مختصر طور پر اشارہ کرکے رسالہ کو ختم کرتے ہیں تاکہ کلام کا انجام آغاز کے مطابق ہو۔ اعتقاد کی فصلیں جملہ تین ہیں۔

اوّل: ربوبیت پر اعتقاد۔ اس اعتقاد کا خلاصہ، تنزیہ کا اثبات اور تشبیہ کی نفی ہے۔ صفاتِ کمال میں سے جو کچھ ہو اس کا اثبات اور متشابہات اور مشکلات سے جو کچھ وارد ہوا ہے اس کی حقیقت پر ایمان رکھنا یا حقیقت کو سونپنا کہ جس سے مراد علمِ الٰہی ہے۔ اس باب میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا کلام نہایت جامع ہے۔ جب اُن سے : اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى (رحمٰن نے عرش پر قرار پکڑا) کے معنی دریافت کئے گئے تو انھوں نے فرمایا: اَلْاِسْتِوَاءُ مَعْلُوْمٌ وَالْكَيْفُ غَيْرُ مَعْقُوْلٍ وَالْاِيْمَانُ بِهٖ وَاجِبٌ وَالسُّؤَالُ عَنْهُ بِدْعَةٌ (یعنی: استواء تو معلوم ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس کی کیفیت و حقیقت مجہول ہے۔ اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے)۔ اور شیخ ضیاء الدین ابو النجیب سہروردی نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفتوں کے بارے میں صوفیہ کا یہی مذہب ہے۔

دوم: نبوت کے درجوں پر اعتقاد رکھنا اور جملہ انبیاء علیہم السلام کی نبوت کو ماننا، اور اُن کی عصمت پر اعتقاد رکھنا اور ان کی عزت و کمال کی پاکیزگی (پر یقین رکھنا)، ہر علم، عمل اور حال سے جو کمال کے مرتبہ کے لائق نہیں ہے، یا جن کی تعویض مشکل یا مشتبہ ہوگئی ہے۔ اور اگر حق تعالیٰ کی جانب سے ان پر عتاب یا خطاب کیا گیا ہو۔ یا کوئی بات جو عزت و کبریائی کی وجہ سے آئے، یا ان کی طرف سے جنابِ کبریا میں کوئی ایسی بات جو تواضع اور بندگی کے اظہار کے طور پر کہی گئی ہو، ہمیں نہیں چاہیئے کہ اس میں مشارکت تلاش کریں۔ اور ان کے ادب اور ان کی بلندی شان

کے منافی اور حفظِ مراتب کا خیال رکھے بغیر کوئی بات کہیں۔ مالک کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے غلام کے لئے جو چاہے کہے، اور غلام کو بھی روا ہے کہ وہ عجز و مسکنت کے ساتھ جو چاہے تمسک کرے۔ کسی دوسرے کی کیا مجال ہے کہ وہ دم مارے۔ اور سید کائنات فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حق میں مختصر اعتقاد یہ ہے کہ کمالات اور کرامات میں سے اُن باتوں کے سوا جو مرتبۂ الوہیت کے لئے ہیں آپؐ کے لئے اور ہر بات کو مانے۔ کائنا ما کان (پھر جو کچھ ہونا ہے سو ہو) ؎

دَعْ مَا ادَّعَتْہُ النَّصَارٰی فِیْ نَبِیِّہِمٖ   وَاحْکُمْ بِمَا شِئْتَ مَدْحًا فِیْہِ وَاحْتَکِمٖ
وَانْسُبْ اِلٰی ذَاتِہٖ مَا شِئْتَ مِنْ شَرَفٍ   وَانْسِبْ اِلٰی قَدْرِہٖ مَا شِئْتَ مِنْ عِظَمٖ

(یعنی: اپنے نبی کے بارے میں جو دعویٰ نصاریٰ نے کیا تھا وہ چھوڑ دے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں تعریف کو حکم دے جو کچھ تو چاہے اور حاکم بن۔ اور بزرگی میں جو کچھ تو چاہے (آپؐ کو) اللہ تعالیٰ کے ساتھ نسبت دے اور عظمت سے اس کی قدر کے ساتھ جو چاہے نسب دے) ؎

مخواں او را خدا از بہر امر شرع و حفظِ دیں   دگر ہر وصف می خواہی اندر مدحش املا کن

(یعنی شریعت کے حکم کے مطابق اور دین کی حفاظت کے خیال سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا مت کہہ، اس کے علاوہ ان کی مدح میں جو خوبی تو چاہے تحریر کر)۔

سوم: آخرت کے بارے میں وہ تمام خبریں جو انبیا اور رسل صلوات اللہ علیہم اجمعین نے دی ہیں ان پر اعتقاد اور اس اعتقاد میں سب کچھ ان خبروں کا صدق اور راستی ہے، اس وجہ سے تغیر و تبدل اور تفصیلات و تاویلات میں غور و خوض کئے بغیر جو صحیح اور واضح ہے وہ وارد ہوا ہے اور تمام اعتقادات کا جامع یہ کلمہ ہے: اٰمَنَّا بِمَا جَآءَ عَنِ اللّٰہِ عَلٰی مُرَادِ اللّٰہِ وَبِمَا جَآءَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ عَلٰی مُرَادِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَبِمَا جَآءَ مِنْ عِنْدِ الْکُمَّلِ الرَّاسِخِیْنَ فِی الْعِلْمِ عَلٰی مُرَادِہِمْ (یعنی: ہم ایمان لائے اس چیز پر جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے قصد و ارادہ کے مطابق آئی۔ اور جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپؐ کی مراد پر آئی اور جو کچھ ان کاملین سے جو علم میں پختگی رکھتے ہیں ان کی مراد سے آئی)۔

حصولِ ایمان اور صحتِ اعتقاد میں اتنا ہی کافی ہے۔ اس کو ایمانِ مجمل کہتے ہیں اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ دین کی ضروریات میں سے جو کچھ بھی ہے اُس پر الگ الگ ایمان رکھتے ہیں۔ اس کی تفصیلات اس رسالہ میں جو اس مقالہ کا ضمیمہ ہوگا بیان کریں گے۔

وَاللّٰہُ الْمُوَفِّقُ وَالْمُعِیْنُ وَھُوَ یَقُوْلُ الْحَقَّ وَیَھْدِی السَّبِیْلِ وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○